رسالہ

تناسخ کا کھنڈن

و

مسیحیت کا منڈن

پر دو لیکچر

تصنیف

پادری ایچ گولک ناتھ

سنہ ۱۹۰۹ء

لودیانہ مشن سٹیم پریس باہتمام وائلی برادرز چھپا

دفعہ اول　　تعداد کاپی ۲۰۰۰　　قیمت ۲ر

دیباچہ

اس رسالہ کے متعلق دیباچہ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہی لیکن ایک صاحب قدردان جو اپنا نام گمنام رکھنا پسند کرتے ہیں اور جنہوں نے اس رسالہ کے ہر د[و] لیکچر کا مطالعہ فرمایا ہی اور بندہ کی خدمت کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا ہی وہ اُسکی داد میں یوں حسن ظن ہیں کہ "عالی دماغ مصنّف نے جیسی بلند نظری سے کام لیا ہی اور نازک خیالات کا اظہار کیا ہی اور جس بے تعصب نگاہ اور منصفانہ مزاج سے اور جدید پیرائے میں اہم مضمون تناسُخ کو جو عیسائیوں مسلمانوں اور ہندوؤں میں امر متنازعہ بنا ہوا ہی وہ نہ صرف اُن کے علم ولیاقت کا ایک عملی نمونہ ہی بلکہ مضمون مذکور کی قدرو انداز وہی شخص کر سکتا ہی جو اتنا ہی بے تعصب اور انصاف پسند ہو ایسوں کے لئے یہہ رسالہ واقعی مفید ثابت ہوگا۔ اِسکا مطالعہ ہر ایک تعلیم یافتہ اور مذہبی مذاق رکھنے والے شخص کو واجب ہی"+

احقر۔ ایچ گولک ناتھ

تناسُخ کا کھنڈن اور مسیحیت کا منڈن

لیکچر اوّل

یہہ مسئلہ جس پر عموماً ہندوؤں اور خصوصاً آریوں کو بڑا ناز و فخر ہی اور جو عقیدہ کے طور پر اس ملک کے لوگوں کی زندگی میں ایک گہرا اثر رکھتا ہی غور طلب ہی۔ اِسلیئے ایک سرسری نظر [ڈ]ال کر یہہ دکھایا جاویگا کہ اِس تعلیم کا انسانی زندگی پر کیا اثر پڑا ہی اور کیا نتیجے پیدا ہوئے ہیں۔
یہہ مرئی امر ہی کہ نیچر میں ہر ایک چیز کا شروع ہی۔ ترقی ہی۔ انجام ہی لیکن بقا کے ساتھ فنا لاحق ہی جسکا شروع و ترقی و کمال ہوا ہی اُسکا زوال بھی لازم و ملزوم کی طرح ساتھ ہی موجود ہے۔ یعنے دنیا ایک بے ثباتی کا عالم ہی اُس میں کوئی جز یا علّت ثبات کا پایا نہیں جاتا ہی۔ جو حالت فر[د] [م]یں ظاہر ہی وہی جماعت میں۔ زوال سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہی۔ ہر کمالے را زوالے کا مصداق ہر ایک مخلوق ہی۔ ہر ذی روح کا حسرت و ارمان انجامی حصہ ہی۔ جو اِس دنیا میں جسمانی لحاظ سے انجام معین تک پہنچ بھی جاتے ہیں تاہم وہ چند روزہ تحصیل ہی۔ یہہ کیا معمّا ہی کہ ہر ذی روح اِس دنیا میں منزلِ تکمیل حاصل بھی کرے پھر بھی اُسکی تمنّا اور اُمنگ بدستور قائم رہے۔ وہ مسافر کی طرح اِس دنیا کے نشیب و فراز طے کر لے اور خالی آیا اور خالی ہاتھ یاس و حسرت کا مرثیہ گاتا ہوا اِس دُنیا سے رخصت ہو۔ اِس کا جواب تناسخ کا مسئلہ سوائے اِسکے

کہ ایسا ہی ہی اور ایسا ہی رہیگا اور کچھ نہیں دیتا۔ مکتی ہوئی تو ہوئی۔ انسان دیوتا بنا تو بنا یہاں کلپ حاصل ہوا تو ہوا لیکن جب کلپ اور پرلے کا دور ہمیشہ سے ہی اور ہمیشہ جاری رہیگا تو یہہ تعلیم ہماری آرزوں اور تمناؤں کا جو مدامی قیام کو چاہتی ہیں کوئی بھی تشفی کا جواب نہیں دیتی بلکہ امید کی انجیل ہونے کے بجائے یاس وحسرت کا طوق ہمارے گلے میں ڈالتی ہی۔ گویا کہ جیو آتما اپنے کرموں کے ہیر پھیر میں کوان کے رہٹ کے گیڑ کی طرح ہمیشہ اپنے محور پر چکر کھاتا رہیگا۔ چنانچہ اس تعلیم کے مطابق یہہ دنیا جیو آتما کے لئے ایک بندھن ہی جس میں بحیثیت منصف پرمیشور جیو کو کرموں کے انوسار پھل بھوگنے کے لئے ڈالتا ہی اور پھر وہ جیو اپنے ہی کرموں کے انوسار سنتی اور اُپاسنا اور یوگ بھیاس کے ذریعہ بندھن سے چھٹکر مکتی کو پراپت ہوتا ہی اور بعد ازاں پھر بندھن میں پھنستا ہی اور یہی سلسلہ جاری تھا۔ جاری ہی اور جاری رہیگا پرمیشور جو خود بندھن میں نہیں آتا وہ اس موجودہ دنیا کو بحیثیت مُنصف اور حاکم پیدا کرتا ہی۔ قایم رکھتا ہی اور فنا کرتا ہی۔ ایشور کے صفات ابدی گیان۔ آنند اور طاقت غیر متناہی ہیں اور جیو کے اچھا دویش۔ پریتن۔ سُکھ۔ دُکھ۔ گیان آتما کے لنگ ہیں ستھیارتھ پرکاش سملاس ساتواں صفحہ ۲۵۲۔ پنڈت دیانند صاحب نے خدا کی ہستی اور ذات وصفات اور دنیا کی بھی ہستی کو قایم کیا ہی لیکن جیو آتما اور پرکرتی اور پرمیشور تینوں کو ازلی مانا ہی۔ ویدانتیوں کے قول کے مطابق برہم ہی سب کچھ ہی۔ وہ جماعت دویت کی قائل نہیں ہی۔ اگر پرمیشور وہ ہی جسکا نہ آدھے اور نہ انت تو اُس کی ازلی وابدی ذات میں کسی دوسری شئے کو شریک کرنا دوئی ہی۔ لیکن ہند و فلسفہ نے دنیا کو بھی ازلی قرار دیا ہی بلکہ کثرت دیوتاؤں کی بنیاد اسی کثرت ازلیت کے ماننے پر واقع ہوئی ہی۔ ویدانتیوں نے اس فلسفہ کو رد کر کے عدم دویت کو تسلیم کیا ہی۔ دنیا ان کے نزدیک ایک

دھوکا ہی یا یہہ کہ پرمیشور ہی نے اس دنیا کو اور جسم کو بنایا اور وہی اُس میں پرویش یا داخل ہوا یہہ دنیا پیدایش سے پیشتر لتشکل است لتشکل آتما اور وشکل برہم تھا پھر وہی پرمیشور اپنی خواہش سے عالم کثرت میں آگیا۔ پرمیشور ہی مشترک علت فاعلی وعلت مادی ہی جس طرح مکڑی باہر سے کوئی شئے نہیں لیتی اپنے ہی اندر سے ریشہ نکالکر جالا بناکر خود اُس میں کھیلتی ہی اسی طرح برہم بھی۔ جو پہلے نہ ہوا اور آخر میں نہ رہے وہ زمانہ میں بھی نہیں ہی۔ چونکہ پیدایش عالم سے پہلے دنیا نہ تھی برہم تھا اسلئے وہی ہی دوسرا کوئی نہیں ہی۔ ویدانتیوں کا یہہ قول کہ خدا کے ازلی وابدی ذات میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہی بالکل صحیح ہی۔ یہہ ہندوؤں کی اُس فلسفہ کی رد میں ہی جو پرکرتی اور جیو کو بھی ازلی مانتے آئے ہیں۔ بائبل کی تعلیم اس کے تصدیق میں یہہ جتاتی ہی کہ پیشتر کوئی یا کچھ تھا خدا فرماتا ہی میں ہوں۔ لیکن ویدانتیوں نے عدم دویت پر تاکید کرتے ہوئے دویت کی ابتدائی ظہور کو بھی تسلیم نہیں کیا ہی۔ پنڈت دیانند صاحب نے دویت کو قایم تو کیا ہی لیکن محیط ومحیط علیہ کے تعلق میں جو ازل سے قائم ہی۔ ویدانتیوں کے مطابق اگر دوئی ہی تو برہم میں ہی۔ وہی ایک سے کثرت میں آتا ہی۔ پنڈت موصوف نے پرمیشور کا کثرت میں آنا رد کیا ہی۔ وہ ابدی گیان ہی وہ بندھن میں نہیں آتا۔ ویدانتیوں کے نزدیک پرمیشور صاحب ارادہ اور طاقت نہیں ہی۔ پنڈت موصوف پرمیشور کو صاحب ارادہ اور طاقت مانتے ہیں۔ اور پرکرتی اور جیو جو غیر مولود اور ازلی ہیں اُنکو برہم کے برابر نہیں مانا ہی۔ جیو پرمیشور کی ازلی رعیت ہی جیو بندھن میں آتا ہی اور سُکھ دُکھ بھوگتا ہی پرمیشور نہیں۔ غرضیکہ آپس کی کھنڈن منڈن میں دوئی کا داغ جو ویدانتی پرمیشور پر لگاتا تھا اُسکو پنڈت صاحب نے بقول طویلہ کی بلا بندر کے سر جیووں پر تھوپ دیا ہی۔ چنانچہ وہ بندھن میں آتے ہیں کیونکہ

پرمیشور خود اُنکو اپادان کارن یا علت مادی پرکرتی سے مدد لیکر جنم دیتا ہے اور پرکرتی کو
غیر محسوس والی حالت سے محسوس والی حالت میں لاتا ہی اور یوں کلپ اور پرلے کا
دور دوراں ہمیشہ جاری رہتا ہی اور پرمیشور اس کام میں ہمیشہ سے مصروف ہی اور رہیگا۔
اس اصول کے مطابق پرمیشور جیو کی طرح مختلف تعلقات سے وابستہ ہی یعنے مادہ سے
اور جیوؤں سے۔ مادہ کو کبھی وہ غیر محسوس حالت سے محسوس میں لاتا ہی اور کبھی پھر غیر محسوس میں
کرڈالتا ہی اور جیوؤں کے متعلق اُنکو ایک جنم سے دوسرے میں اور دوسرے سے تیسرے
میں اور کبھی بے جنم کرڈالتا ہی۔ یہہ تو وہی بات ہوئی بیکار مباش کچھ کیا کر۔ کپڑے ہی پھاڑ سیا کر۔
یوں وہ ایشور کیا ایک خالی بیٹھا ہوا بنیا ہوا۔ جو بٹے ہاڑا کرتا کہ سے
اس جسم سے بیکے ٹھونسے اُس جسم میں جان ÷ اس کوٹھی کے اُس کوٹھی میں بھرتا ہی دھان.
اگر پرمیشور تعلقات سے گھرا ہوا ہی تو وہ جیو کی طرح محتاج بالغیر ہی۔ میرے بدن میں ایک عضو
آنکھ ہی یہ آنکھ بغیر روشنی کے جو اُس سے فی الخارج ہی بے مطلب ہی مگر روشنی تو چیزوں کے دکھلانے
کا ایک ذریعہ ہی اور بغیر چیزوں کے روشنی بھی بے سود ہی۔ لہذا جسنے آنکھ بنائی اُسنے روشنی کو
بھی بنایا اور ان چیزوں کو بھی جنکو بطفیل روشنی دیکھا جاوے۔ لہذا انسان تعلقات سے گھرا ہوا ہی اسکی
روح میں بعض مدامی اور لازم اصول مذکور ہیں۔ مثلاً بداہتاً ہماری عقل کا یہہ تقاضا ہی کہ وہ معلول
کا علت کیساتھ رشتہ قایم کرے اور بطور جواب نیچر کے تمام حادثات میں یہہ رشتہ علت و معلول کا مشاہدہ
میں آتا ہی یوں مشاہدہ اور استقرار سے ہمارا علمی تجربہ بڑھتا ہی اور واقعی نیچر کے کل ظہور میں قاعدہ استقرار
قائم ہی اگر ہم خوبصورتی کو پسند کرنیکا جوہر رکھتے ہیں تو نیچر درحقیقت ایک خوش پیرایہ میں ہم کو نظر آتا
ہی اگر کوئی پوچھے کہ یہہ کسطرح ہوگیا تو کوئی بھی ذی عقل یہہ جواب نہیں دیگا کہ یہہ یونہیں یا

اٹکل پچو ہوگیا بلکہ نیچر میں آثار ارادہ دیکھکر وہ یہی استدلال کریگا کہ اس دور اندیش نسبت کا
قائم کرنے والا باشعور خدا ہی۔ اب چونکہ بقول آریہ خدا ہی اور مادہ بھی ہی اور جیو بھی ہی اور تینوں
ہمیشہ سے ہیں اور ان تینوں میں وہی نسبت نظر آتی ہی جو میری آنکھ اور روشنی اور چیزوں
میں موجود ہی تو ضرور بالضرور ان تینوں پر اور اُن سے اعلے کوئی ایسی باشعور ہستی ہی جس نے
ان تینوں میں یہہ حکیمانہ نسبت قایم کی ہی۔ تو ثابت ہوا کہ پنڈت صاحب نے خدا کو جیو کی طرح
محتاج بالغیر بنا ڈالا ہی۔ وہ محتاج ہوا روشنی کا وہ محتاج ہوا حکمت کا وہ محتاج ہوا ہر ایک چیز
کا۔ اگر پرمیشور مادہ کو غیر محسوس حالت سے محسوس حالت میں لاتا ہی اور اسی کا نام ایشور
سرشٹی ہی تو اُسکا منصب جیو سے بڑا نہیں ہی۔ کیونکہ مادہ کا کوئی ذرہ خواہ غیر محسوس یا محسوس
والا حکمت سے خالی نہیں ہی اسلئے پرمیشور مثل جیو کے درک کرنے والا۔ یاد کرنے والا اور علم فراہم
کرنے والا ہوا۔ چونکہ مادہ کا کوئی ذرہ بھی حکمت سے خالی نہیں ہی اسلئے مادہ پرست نے مادہ
ہی کو ہر ایک چیز کی علت سمجھا ہی۔ اسکے علاوہ جو دوبیت پنڈت موصوف نے قایم کی ہے۔
وہ تو شرک میں شامل ہی اُس سے ویدانتی ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بائبل کی تعلیم کے مطابق
نظام قدرت کا علت ایک ایسا وجود رکھتا ہی جو باشعور اور بالارادہ ہی۔ مادہ میں ہم کو کوئی ایسی
خصوصیت نظر نہیں آتی جو ازلی قرار دی جاوے۔ ظاہری مادہ از قسم وجود نہیں اُسکی اصلیت و
ماہیت کو جو اُسکے ظاہر ہونے کا باعث ہی کسی محقق نے بیان نہیں کیا ہی لیکن بائبل میں اُس کی
خلقیت کے بارے میں بیان ہی کہ زمین ویران اور سنسان تھی یعنے عبرانی میں توحو اور بوحو یعنے
غیر محسوس ہوتا آیا ہی یعنے بروقت خلق اُس کی کوئی شکل یا صورت یا ترتیب نہیں تھی۔ ابتدا
میں خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ عبرانی میں مادہ کی جگہ دو الفاظ زمین و آسمان استعمال ہوئے

ہیں۔ اِس اصولی پیدایش کی ابتدائی حالت ویران و سنسان تھی جسکو خدا نے ترتیب
دیا لہذا مادی چیزوں کا آغاز زمانہ میں ہوا فعل پیدایش ایک صریح معجزہ ہی۔ علم طبعیات اپنا
بیان مشاہدات پر کرتی ہی۔ اُس کی علمی بنیاد حقیقت اور واقعات پر ہوتی ہی وہ کچھ فرض نہیں
کر لیتی یہہ کہنا کہ مادہ نیست نہیں ہو سکتا ہی اسلئے ازلی ہی اس میں پہلا جملہ تو سائنس کے
مطابق بیان ہوا لیکن نتیجہ جو دوسرے جملہ میں بیان ہوا وہ اُس اصول کے خلاف نکالا گیا ہی
یہہ صحیح ہی کہ ہم اُن وسائل یا آلات سے جو ہمارے پاس موجود ہیں اور اُس طاقت سے جو
ہماری ہی اور اسوجہ سے بھی کہ ہم محتاج بالغیر ہیں ہم مادہ کو نیست نہیں کر سکتے لیکن یہہ نتیجہ
نکالنا کہ وہ ازلی ہی غیر سائنٹیفک ہی حقیقی سائنس ڈھکوسلوں سے کام نہیں لیتا جبحال کہ
مادہ کا ادنےٰ ذرّہ بھی ترتیب سے خالی نہیں تو جس نے مادہ کو مرتب کیا وہ مادہ سے مقدم
ہوا۔ علاوہ تین ازلیوں کے بجائے قانون اختصار بہت سے اسباب کی جگہ ایک ہی کافی اور
مناسب حال سبب کو چاہتا ہی تو جب شعور صریح ترتیب کا کافی سبب نظر آتا ہے تو مادہ کی
کی خلقت کا کافی سبب بھی خدا ہی ہی۔ ہم مدارج اسباب نیچر کو تسلیم کرتے ہیں مثلاً علّت فاعلی۔
علّت مادی علّت صوری وغیرہ مگر دور و تسلسل سے بچنے کے لئے لازم ہوگا کہ نظام کائنات کے
سبب در سبب دریافت کرتے ہوئے قیام علّت العلل پر ہووے جو معلولات کا اوّل اور
آخر سبب ہی۔ اِس کی مزید تصدیق کے لئے ہم کو آلہی ہدایات کی ضرورت ہی تاکہ قوا انسانی
کی تحقیقات کا اعلان معتبر اور مستند طور پر ہو۔ بائبل کی تعلیم کے مطابق دوئیت ہی اور اس دوئی
کا قایم کرنے والا خدا خود ہی۔ یہہ دوئی زمان و مکان میں موجود ہی اور خدا خود زمان و مکان سے
منزّہ ہی۔ وہ زمان و مکان سے برتر بلکہ اُسکا سہارا ہی اسی واسطے جب کہا جاتا ہی کہ خدا غیر متناہی

ہی تو اُس کے یہہ معنے ہی کہ مکان اُسکو محدود نہیں کر سکتا کیونکہ وہ حد سے برتر اور اعلےٰ ہی
وہ مکان میں نہیں ہی بلکہ مکان اُس سے ہی۔ اور جب کہا جاتا ازلی تو یہہ معنے ہیں کہ زمانہ
اُسکو ناپ نہیں سکتا۔ اگر پرمیشور محیط ہی اور دوسری چیزوں کا تعلق اُسکے ساتھ محیط علہ کے
ہی اور وہ سب میں سمایا ہوا ہی تو کیوں نہیں وہ سب کی علت مانا جاوے ورنہ وہ بھی زمان و
مکان میں آگیا۔ اور جب زمانہ ایک حد فاصل ہی جس میں سلسلہ وقت کا پایا جاتا ہی اور جو اندازہ
میں آسکتا ہی تو خدا بھی اندازہ میں آیا۔ اور جب مکان وہ ہی جس میں مادہ وغیرہ موجود ہی
اور محدود ہی تو خدا بھی محدود ہوا۔ اگر وہ موجودہ سرشٹی کا پیدا کرنے والا ہی اور فنا بھی تو کیوں
نہیں وہ پرکرتی کا بھی بنانیوالا ہو جبحال کہ سائنس کی آنکھوں سے دیکھنے سے وہ بھی اپنی
ترتیب میں خدا کی حکمت کی شہادت دیتا ہی جب پرمیشور کو گیان رکھنے والا اور علیم کل
مانا جاتا ہے تو اگر اس کے یہی معنے ہیں کہ وہ نیچر کی رگ رگ سے واقف ہی تب تو
انسان بھی جبحال کہ اُسکے پاس عقل کے آلات موجود ہیں کبھی نہ کبھی علیم کل ہونے کا مجاز
رکھیگا۔ اور اگر اِسکے یہہ معنے ہیں کہ وہ بحیثیت محیط محیط علہ جیو پر حاوی ہی تو کیوں نہیں خدا
کو گیان اور وید یا اور ہر ایک خدائی صفت کا چشمہ و منبع مانا جاوے؟ انسانی تقاضا توحید
قایم کرنا چاہتا ہی۔ خدا کی ذات میں جو المطلق یعنے جو شرط مشروط سے مبرّا ہی اور جو اپنا سبب
خود آپ ہی یعنے واجب الوجود ہی اُس پاک ذات میں دو دیگر ازلی وجودوں کو انسانی عقل
قبول نہیں کر سکتی ہی نہ صرف ویدانتی بلکہ مادہ پرست بھی کثرت ازلیت کو رد کرتا ہی تین ازلیوں
کے قایم کرنے میں خدا کی ہتک اور بے قدری ہوتی ہی اور اُس کو محتاج بالغیر بنایا جاتا ہی جو
پرکرتی کی مدد سے سرشٹی بناتا ہی اور جیوؤں کے اعمال کے ثمروں میں اُنکو مختلف جسم دیتا

رہتا ہی وہ پرپیشور کیا ایک بھانمتی ہوا سے

کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا + بھانمتی نے کومبا جوڑا۔

اِس پر مادہ پرست کو اعتراض کی پوری گنجایش ملجاتی ہی کیونکہ وہ بھی توحید کی تلاش میں مادہ اور جیو میں تمیز نہیں کرتا۔ وہ دنیا کے ظہور کو مادہ ہی کا فعل بتاتا ہی۔ مادہ خواہ لطیف ہو خواہ کثیف اس میں تین صفتیں موجود ہیں۔ شکل عرض و طول اور مقدار۔ علاوہ طاقتیں بھی موجود ہیں۔ اِن ذرّوں کے آپس کی مختلفہ کیمیائی اور کشش وغیرہ انصال و پیوستگی سے موجودہ دنیا مرتب ہوئی ہی۔ ازلی مادہ ہی اُسکے قول کے مطابق کل موجودات کا موجب اور اصل ہی۔ مادہ ہی کے اجزا کا مختلفہ طور پر فراہم ہونے سے مختلف چیزیں پیدا ہوئی ہیں جو نظامِ قدرت سے تعبیر کی جاتی ہی۔ اِس سے ثابت ہی کہ جیسے ویدانتی دویت کا قایل نہیں ویسا ہی مادہ پرست دویت کو رد کرتا ہی اور نیچر ہی کی سُتتی اور اُپاسنا جائز قرار دیتا ہی چنانچہ ایک جرمنی کا فیلسوف نیچر سے یوں دست بدعا ہوتا ہی۔ ای نیچر تمام وجودوں کا حاکم اور ای نیکی عقل اور سچائی تم جو اُسکی توقیر و تعظیم کرنے والی ٹیّاں ہو۔ تم جو واقعی واجب تعظیم کے لایق ہو سدا ہمارے محافظ رہو۔ تم ہی نوع انسان کی سُتتی کے لایق ہو۔ دنیا کی عبادت کے تم ہی مستحق اور تم ہی کو زیب ہی۔ ای نیچر ظاہر کر کہ وہ خوشی جس کی تو چاہتا ہی کہ ہم خواہش کریں کسطرح حاصل ہو۔ ہمارے دماغ میں سے اودیا اجہ بر اگیان دور کر اور ہمارے دل سے شرارت اور قدموں کے آگے سے تاریکی رفع کر۔ علم کا تسلط پیدا کر۔ ہماری آتماؤں کا زیور نیکی ہو اور ہمارے سینوں میں شانتی قائم ہو۔ خیر یہہ تو تمہید اُبیان ہوا اب مسئلہ تناسُخ کی طرف پھر رجوع ہوتے ہیں۔ اس تعلیم کے مطابق جیو کے بندھن اور مکتی کا سلسلہ ہمیشہ

قائم رہیگا۔ مسیحی تعلیم کے مطابق اِس دنیا کی موجودہ بے ثباتی کی حالت گناہ کی وجہ سے ہی۔ انسان اِس دنیا میں بندھن کی حیثیت میں نہیں آیا ہی بلکہ وہ اس دنیا کا سرتاج یا خلیفہ بنایا گیا تھا۔ اُس کی برگشتگی اور گمراہی کی وجہ سے تمام دنیا لعنت کا باعث ہوئی ہی۔ کیونکہ خدا کی مرضی کے خلاف ہوکر اُس نے اپنی تمام عطیات اور نیچر کی نعما کو حلال کی جگہ اپنے اوپر حرام کیا ہوا ہی۔ اور نفس پرستی اُس کی زندگی کا شیوہ ہو گیا ہی۔ یہہ دنیا جو خدا کی فرمانبرداری اور حلقہ بگوشی میں اُسکے فائدہ کا باعث ہوسکتی تھی گناہ کی وجہ سے اسکے نقصان کا باعث ہوئی ہی۔ تاہم موت انسان کا طبعی حصّہ نہیں ہی۔ اَب بھی اُسکے لئے قیام کا دروازہ کُھلا ہی اور وہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوسکتا ہی +

تناسُخ کی تعلیم کے مطابق یہہ نظام قدرت کبھی کلپ میں آتا ہی اور کبھی پرلے میں۔ لیکن یہہ رازِ سر بستہ جسکا نام دنیا ہی ایک علامت یا سایہ کی طرح ہم کو نظر آتی ہی۔ اس میں کوئی چیز قائم نظر نہیں آتی یہہ تو انگشتِ شہادت کی طرح وہ دنیا دکھاتی ہی جسکو قیام ہی اور جو روحانی ہی اور جس کی یہہ دنیا شاہد و گواہ ہی۔ یہہ دیکھی دنیا اندیکھی دنیا کا سبق پڑھاتی ہی۔ دیکھی دنیا میں پھنس کر انسان نفسانی بنتا ہی لیکن اندیکھی دنیا کو مدنظر رکھکر انسان اِس دنیا کو زیر تابع کرتا ہی اور ابراہام کی طرح اِس دنیا کو چراغ ہدایت بناکر اپنی آنکھیں اندیکھی یا روحانی دنیا کی طرف لگائے مردانہ وار آگے بڑھا جاتا ہی۔ ہمارے بیان سے یہہ مراد نہیں ہی کہ یہہ دنیا جاتی رہیگی بلکہ یہہ کہ متبدل ہوکر مناسب حال صورت اختیار کریگی جو ہماری اپنی تبدیل حالت کے عین شانِ شایاں ہوگی جس میں زوال کا نشان تک باقی نہ رہیگا۔ جیسے صبح کی شبنم سورج کے نکلتے ہی غائب سی ہو جاتی ہی مگر آسمان کے قوس قزح میں اسکے گوناگوں رنگون

میں تاباں ہوئی ہی اسی طرح اِس دنیا سے انتقال کرکے آسمانی بادشاہت میں داخل ہوتا ہی
بادشاہت مذکور جس کی مسیح خداوند نے کمال تصریح و وضاحت کے ساتھ تعلیم دی اور جسمیں
وہ خود اِس موجودہ دنیا میں سے ہوکر داخل ہوا وہ دنیا اِس موجودہ دنیا کا حقیقی جواب ہی۔
یہہ دیکھی ہی وہ اندیکھی ہی۔ اِس دنیا کو جیسے پولس رسول فرماتا ہی دردِزہ لگی ہوئی ہی وہ اُس
حالت کو پراپت ہونا چاہتی ہی جس میں قیام وثبات وتکمیل ہو۔ سائنس کے رو سے اِتنا
تو ثابت ہی کہ نیچر کی موجودہ صورت نہیں رہیگی۔ اس پر الہامی تعلیم مستند طور پر یہہ روشنی
ڈالتی ہی کہ یہہ آسمان و زمین بدل کر ایک نیا آسمان اور ایک نئی زمین ہو جاویگی۔ زوال جاتا
رہیگا اور خدا کا خیمہ آدمیوں کے ساتھ ہوگا۔ وہ اُنکے ساتھ سکونت کریگا وہ اُس کے لوگ
ہونگے اور خدا اُنکا خدا خود اُنکے ساتھ رہیگا۔ وہاں نہ موت اور نہ دکھ اور نہ رونا ہوگا۔ لیکن
تناسخ کی تعلیم کے مطابق مکتی چند عرصہ کے لئیے ہوگی کیونکہ کلپ اور پرلے کا دور ہمیشہ جاری
رہیگا۔ جیو کے کرم انادی ہیں کیونکہ جیو اچھا وغیرہ صفات سے موصوف محدود العلم و ابدی
ہی اور اُسکے صفات وحرکات وحواس بھی ابدی ہیں اور پھر پنڈت صاحب فرماتے ہیں کہ جیو
اپنے کاموں میں سوتنتر یعنے خودمختار اور کرموں کے نتیجہ پانے میں بموجب آئین ایشور
کے پرتنتر یعنے تابع مرضی ہی پھر سماس آٹھویں بیان پر کرتی جیو اور پرمیشور غیرمولود تینوں اِس
عالم کے مسبب ہیں اُن کی کوئی علت نہیں جیو اس ازلی پرکرتی کا خط اُٹھاتا ہوا اُس میں
پھنستا ہی۔ متذکرہ بالا اقتباسات سے عیاں ہی کہ انسان کی مکتی برائے نام ہی۔ جیو چند عرصہ
کے لئے جنم و مرن سے دیوتا بنا تو بنا لیکن پھر اس ازلی پرکرتی کا خط اُٹھاتا ہوا بار بار پھنسیگا
اور بار بار چھٹیگا۔ جنم لینا کلپ میں آنا ہی اور مرنا ایک قالب سے دوسرے میں جانیکا نام ہی۔

انجیلی اصطلاح میں نجات زندگی کا حاصل کرنا ہی۔ استعداد ودیعی کا غیر واجب استعمال کرنا موت
ہی اور انکا خدا کے زیر تابع ہوکر واجب استعمال کرنا زندگی ہی۔ اگر جیو آتما کا یہہ حال ہی کہ
کرموں کی شامت کا مارا ہوا بار بار جنم بھوگے اور بار بار مریگا اور سوائے اِسکے کوئی چارہ
نہیں تو پھر نجات نہ ہوئی۔ ایک طرف تو بحیثیت سوتنتر وہ مجبور اور دوسری طرف بحیثیت
پرتنتر دوسرے کے بس میں۔ گویا یہہ مسئلہ یہہ سکھاتا ہی کہ انسان کے خواص وحواس
ازل سے ایسے واقع ہوئے ہیں کہ جو کچھ وہ کرتا آیا ہی وہی بدستور کرتا چلا جاویگا۔ وہ
خود اپنی ذات سے مجبور اور خدا بھی مجبور۔ مکتی کے بارہ میں پنڈت موصوف فرماتے ہیں
کہ پرمیشور میں قیام کرکے دھرمی لوگ موکش کے سکھ کو بھوگتے ہیں اور اُنکو سب لوک
اور سب خواہشیں حاصل ہوتی ہیں وہ جسم ارادی سے آکاش کے اندر پرمیشور میں پھرتے ہیں۔
ہم پوچھتے ہیں کہ جب اُنکو یہہ خیال آتا ہوگا (کیونکہ موکش کی حالت میں یاد کی صفت اور
خیال میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہو سکتی) کہ یہہ سب مکتی کے سکھ بھوگ اُنکو پھر دنیا
میں بار بار جنم لینا اور مرنا ہوگا تو وہ سکھ۔ سکھ کیسے بنا رہتا ہوگا؟ اس دنیا میں ایک ہی موت
ایک ہی بیماری کیا ستم ڈھاتی ہی۔ کسقدر رونا چھاتی کا پیٹنا اور دکھ ہوتا ہی! ایک سنجیدہ
اور فکر کرنے والے شخص کے لئے موت کا نظارہ ایک خطرناک نظارہ ہی اور جب ساتھ
ہی یہہ خیال دامنگیر ہو کہ میرا آئندہ حشر کیا ہوگا تو اُسکا سکھ۔ سکھ نہیں رہیگا۔ ہاں بےفکر
آدمی تو وقت کو غنیمت سمجھ کر کھلائے پئے اور اُڑائیگا اور زبان حال سے یہی کہیگا کہ ایہو
جگ میٹھا دوجا کن ڈٹھا لیکن یہہ اُس کی مورکھتائی شمار ہوگی۔ اس طرح سے وہ جیو
جسنے پرمیشور میں سکھ بھوگا ہو اور اُسکو خیال آیا کہ بار بار جنم لینا اور مرنا ہوگا تو وہ سکھی نہیں رہیگا۔

بلکہ دُکھی ہوجاویگا۔ پنڈت لیکھرام کا یہہ کہنا کہ جس طرح کہ ایک پرندہ درخت کی ایک شاخ
سے دوسری پر اُڑجاتا ہی اور اس سے تیسری پر اسی طرح جیو ایک سے دوسرے میں پرواز
کرجاتا ہی اسلئے روح کے نکلنے کو ایسا سمجھنا چاہئے جیسے کہ ایک پرندہ کسی درخت پر سے اپنی
خوشی اُڑجاتا ہی بے ثواب ہی کیونکہ پرندے کا اُڑنا اُسکا خاصہ ہی لیکن موت انسان کا طبعی حصہ
نہیں ہی۔ بلکتی دائمی کیوں نہیں ہوسکتی اسکا جواب یہہ دیا جاتا ہی کہ انسان محدود العقل ہی۔
یہہ سچ ہی کہ انسان کی عقلی علم کی ایک حد معین ہی۔ انسانی عقل ایک آلہ دریافت ہی اور باطنی
اور خارجی ذرایع سے جو کچھ اُسکو میسّر ہوتا ہی اپنے ادراک و فہم میں لاتی ہی۔ لیکن انسانی
عقل میں رسائی ہی جو مرتبہ امکان رکھتی ہی اور اُسکی رسائی کی کوئی حد نہیں ہی۔ جب خدا تمام
اپنے اوصاف و صفات میں علم و حکمت کا چشمہ و منبع ہی اور وہ ازل سے کمال کی صورت میں
اس میں موجود ہی تو کونسا امر مانع ہوسکتا ہی کہ انسان جو ازخود نہیں ہی بلکہ اُس کی تمام زندگی
کا انحصار خدا پر ہی وہ اُس کی مرضی کے زیر تابع ہوکر روز بروز ترقی نہ کرسکے۔ جیسے چشمہ میں سے
پانی پیکر چشمہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی اسی طرح خدا کے جاننے میں انسان کا سکھ بڑھتا ہی
اور وہ سیر نہیں ہوتا۔ سیر ہونا بدن کا خاصہ ہی نہ کہ آتما کا۔ پنڈت لیکھرام حیوانی جیو اور انسانی
جیو میں فرق نہیں کرتے دونوں کی ایک سی روح ہی لیکن حیوانی جیو کی ساخت و ترکیب میں
جو قابلیتیں، ضروریات اور خواہشات موجود ہیں اُنکے لئے نیچر میں پورا سامان نظر آتا ہے۔
نباتات کی ضروریات نشو و نما اور انجام کے لئے اسی زمین میں سب کچھ موجود ہی۔ پرندوں اور
بہایم کی ضروریات بھی خوراک روشنی۔ گرمی۔ ہوا۔ پانی وغیرہ سب موجود ہی۔ اور انجام کے
لحاظ سے بھی ذی جان نیچر ہی کے اندر تکمیل تک پہنچ جاتا ہی لیکن انسان کی رُوح اس دنیا سے

سیر نہیں ہوتی۔ اُس کی حالت ماہی بے آب کی طرح ہی جسکو نہ اس پہلو چین اور نہ اُس کروٹ
آرام۔ اُس میں ایسی خواہشات اور تمنائیں اور ضروریات موجود ہیں جنکا جواب نیچر میں نہیں
ملتا۔ وہ ایسی دنیا کا مطالبہ کرتی ہی جس میں اُس کی عقل کو وسعت حاصل ہو جس میں وہ
سُکھ حاصل ہو جو دنیا دے نہیں سکتی۔ وہ اُس کی قربت حاصل کرنا چاہتی ہی جو اُس سے
اعلےٰ اور برتر بلکہ چشمۂ حیات ہو۔ وہ ازخود نہیں اُسکا انحصار دوسرے پر ہی ایک اعلےٰ ہستی
پر جو اُسکا محاصرہ کرتی ہی اور جسکے بدوں اُسکا کوئی تکیہ و سہارا نہیں ہوسکتا۔ جیسے چلتا ہوا
پانی ہمیشہ جنبش کرتا اور بے چین اور مضطر بہتا رہتا ہی تا وقتیکہ اپنی سطح کھوج نہ لیوے اسی طرح
سے ذی روح کو قرار تب ہی ہوتا ہی جب وہ خدا کے زیر تابع ہوکر جیتا ہی۔ انسان ازل سے
نہیں ہی بلکہ اُس کی تمام زندگی اس امر پر شاہد ہی کہ وہ زیر تابع ہی۔ ازخود نہیں بلکہ خدا
اُس کی اصل ہی۔ خدا کی نظر میں انسانی مرتبہ نہایت ہی افضل ہی لیکن وہ خدا کی مخلوق ہے
اُسکو ایسے استعداد عطا ہوئے ہیں جنکو کام میں لاکر وہ اس دنیا کو اپنی رہایش کے لایق
بنا سکتا ہی جنگل کو منگل اور پرندوں اور بہایم کو اپنے زیر تابع کرسکتا ہی اور اپنی شان و
شکوہ کو ظاہر کرنیکا مادہ اُس میں موجود ہی۔ باوا آدم موجودات کی تحقیقات کے لئے بحیثیت
پہلا سائنٹسٹ باغ عدن میں رکھا گیا تھا۔ اسکے قوا سالم تھے اُسکا باطن صاف تھا اسکی
حالت عصمت کی تھی۔ اُسکا لوحِ دل محفوظ تھا اُس میں نہ صرف پاکیزہ زندگی بسر کرنیکا امکان
تھا بلکہ خدا کے زیر سایہ عاطفت اور اطاعت ہوکر وہ علوم و فنون اور تہذیب اور اخلاق
میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرسکتا تھا۔ اس میں خدا کے زیر تابع ہر ایک چیز کا امکان
تھا سُکھ بڑھانے کا امکان علم حاصل کرنے کا امکان۔ پاکیزہ زندگی بسر کرنیکا امکان اور

نیچر کو اپنی حکومت میں لانے کا امکان تھا۔ یہہ سچ ہی کہ باوا آدم اُس امکانی عزم میں ثابت
قدم نہیں رہے لیکن اُس کی وجہ عدم قدم ہی۔ اُس باغ کے بیچوں بیچ زندگی کا درخت اور نیکی اور بدی
کی پہچان کا درخت بھی موجود تھا۔ دونوں درخت صورتِ علامت تھے۔ نیکی اور بدی کا درخت
اُس علم کی علامت تھا جو آدم خدا کی حلقہ بگوشی اور اطاعت میں نیکی اور بدی کی تمیز کر کے
حاصل کر سکتا تھا کیونکہ خدا کے زیرِ اطاعت رہکر وہ مخالف خیالوں کا جو آزمایش کی صورت
میں اُسکے آگے آئیں بخوبی مقابلہ کر سکتا تھا اور اُن پر غالب آکر اپنی فعل مختار آزادی کے
اصلی حد تک پہنچ جاتا اور شریعت کی پابند آزادی کو کام میں لاکر نیکی اور بدی کی صحیح اور واجب
تمیز کر لیتا بجائے اسکے خدا کی مقرر کردہ تجویز سے تجاوز کر کے اُس نے ممنوع درخت کے پھل
میں سے یہہ سمجھ کر کھالیا کہ وہ خدا کی طرح نیکی اور بدی کے پہچاننے والا ہو جاویگا۔ گویا خدا کے
برابر ہونے کا احتمال اسکے تصور و دماغ میں بندھ گیا اور نتیجہ یہہ ہوا کہ نیکی اور بدی کی تمیز تو اسکو
تجربہ کر کے حاصل ہوئی مگر اس طور پر کہ عبد کی حیثیت میں اُسنے اپنے معبودِ حقیقی کی نافرمانی کی
اور روح میں گناہ کے بیج کے داخلیابی سے اُسکو زندگی کے عوض موت کا منہہ دیکھنا پڑا لیکن
جو اُس سے پورا نہیں ہوسکا وہ آدمِ ثانی یعنے خداوند مسیح سے پورا ہوا۔ وہ عصمت کی حالت
سے از راہ عزم الوالعزم ثابت ہوا۔ وہ نیچر پر قابض تھا وہ نیچر کے اسباب کے استعمال میں پورا
حاوی اور نیچر کی خبر و معلومات میں علم محیط و کل رکھتا ہوا ثابت ہوا۔ وہ ہر فن و ہنر میں طاق
اور حکمت و فضل میں شہرہ آفاق تھا۔ اگر وہ طبیب تھا تو اسکی طبابت نیچر کے ہر ایک برگ بوٹے
سے واقف ہر ایک مجرّب نسخہ سے آشنا مرض کی تشخیص میں دسترس کامل اور علاج میں ید بیضا
کا حکم رکھتی ہی۔ اُس نے ابنِ آدم ہو کر پیش خیمہ کے طور پر حضرت انسان کا وہ مرتبہ امکان

دکھایا ہی جو وہ ترقی کے زینہ پر خدا کا بندہ ہو کر متواتر حاصل کرتا رہیگا۔ ذی روح کو عبد کی حیثیت
میں جو اسکا عین زیبائی پہلو ہی اور اپنے معبود کی حلقہ بگوشی میں دائمی سُکھ اور دائمی
اطمینان حاصل ہو سکتا ہی لیکن تناسُخ کے ماننے والے کو جو خدا کے علاوہ جیو اور پرکرتی کو بھی
انادی تصور کرتا ہی بجبر یہہ تسلیم کرنے کے چارہ نہیں کہ انسان جیسا کرتا آیا ہی کرتا چلا جاویگا
وہ بھی مجبور ہے پرمیشور بھی مجبور۔ پرمیشور کا وصل بھی حاصل ہوا ہم کے ساکشات سمبندھ
میں بھی رہا اور سب خواہشیں بھی حاصل ہوئیں (دیکھو سملاس نوان مکتی کے بارہ میں) جو
ارادہ میں آیا وہ وہ عالم اور وہ وہ خواہش حاصل ہوئی لیکن تاہم اسکو مکتی سے پھر بندھ میں
آنا ہوگا۔ گویا مکتی کی حالت میں سیری ہونے سے بندھ میں آویگا اور یہاں سیری ہونے
سے پھر مکتی کا راہ لیگا۔ یہہ عجیب فلسفہ ہی جسکے یہہ معنے ہیں کہ آدمی گیان حاصل کر کے پھر اگیانی
ہوگا اور پھر گیانی اور یونہی یہہ سلسلہ مکتی۔ دویا اور گیان اور بندھ اودیا اور اگیان کا جاری
رہیگا۔ پنڈت موصوف نے ویدانت کھنڈن میں پرمیشور کو نرگن۔ رجوگن اور ستوگن کا پتلہ
ہونے سے تو بچا یا لیکن وہ سب کچھ جیو آتما کے ماتھے تھوپ دیا۔ حتےٰ کہ ذی روح دائمی آنند
بھوگنے کے قابل نہیں کیونکہ وہ محدود ہی۔ تناسُخ کی فلسفہ کو کہیں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں
بلکہ خود آواگون میں چکر کھاتی پھرتی ہی ہم پوچھتے ہیں کیا ایشور کے ساتھ ہونے اور تعلق
بالمشافہ سے وہ سب خدائی کو حاصل کر لیتا ہی۔ یا سکھ کا بوجھ اُس پر ایسا پہاڑ کی طرح ٹوٹ
پڑتا ہی کہ وہ اُس کا متحمل نہیں ہو سکتا اسلئے اسکو پھر بندھ میں آنا لازمی ہی؟ اس میں تو اوّل
کرموں اور انصاف کی فلسفہ جاتی رہی۔ اور دوم انسانی ترقی میں مراتب ہیں اس نیچر ہی
میں جب انسان پیدا ہوتا ہی تو تمام نیچر کی کتاب اسکے سامنے کھلی ہوئی ہوتی ہی لیکن اسکا

پڑھنا اور سمجھنا بتدریج ہوتا ہی نہ صرف بتدریج بلکہ قدیم زمانوں سے لیکر آج تک وہ کتاب پوری پڑھی نہیں گئی ہی چہ جائیکہ ایک فرد اُسکا اپنی ایام زندگی میں بذریعہ مطالعہ عبور کر سکے سر آئزک نیوٹن صاحب گو بمقابلہ دوسروں کے اپنے زمانہ میں یکتا اور نیچر کے مطالعہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے تاہم انہوں نے یہہ فرمایا اور تحقیق فرمایا کہ میں تو سمندر کے ساحل پر کھڑا ہوا چند کنکروں کو اُٹھا رہا ہوں حالانکہ ابھی تک کل سمندر میرے سامنے ہی اسکو میں نے چھوا تک بھی نہیں ہی تب سے باوجود کثرت ترقی کے اگر آج کے کسی علامۂ دہر محقق سے پوچھا جاوے کہ تو نے علم کے سمندر میں کہانتک عبور کیا ہی تو وہ بسا ماہران فن کی طرح یہی کہہ اُٹھیگا کہ جو کچھ جانا گیا ہی اُس سے کہیں بڑھکر دنیا ہی جو جانی جا نہیں سکتی لیکن تناسخ کی تعلیم عجب ستم ڈھاتی ہی کہ جیو آتما خدا کے نزدیک ہو کر بھی اور اُسکے حضور پھر کر ابھی اس ناپید اور بے پایاں خدا میں کچھ دیکھنے بھی نہیں پایا تھا کہ اپنے کرموں کی بخت خفتہ شامت کے مارے اُس کو مکتی سے پھر بندھ میں آنا پڑا۔ غرضیکہ جب موکش اور بندھ کا دور ہمیشہ جاری رہیگا تو اُسکا یوگ بھیاس اور اُس کی اُپاسنا اور دھرم بجائے خود اُسکو نہ گیانی بنا سکتا ہی اور نہ سکھی دیتری اطاعت ہی میں ہم کو سکھ اور چین ہی In la sua voluntadeenostra pace.

یہ ڈانٹی کا قول ہی اور یہی مسیحی تعلیم کا لب لباب ہی کہ انسان نجات یافتہ ہو کر خدا کی قربت میں ہمیشہ سکھی رہ سکتا ہی اور اُسکا سکھ جوں جوں وہ خدا کی قدرت اور حکمت اور رحمت اور انتظام پر غور کریگا اور اُس سے آشنائی حاصل کریگا اسیقدر زیادہ بڑھیگا اور وہ جئے گا۔

مطابق پنڈت دیانند صاحب جنم لینا قالب میں آنا اور دُکھ سُکھ کا بھوگنا ہی۔ اور مرنا ایک قالب سے دوسرے قالب میں جانیکا نام ہی۔ گویا جینا مرنا کرموں کا پھل ہی اور بس ہم دیکھتے

ہیں کہ نباتات اور حیوانات دونوں میں جینا اور مرنا ہی۔ جینا تو یہہ ہی کہ ذی جان کا باطنی خصوصیت سے تعلق خارجی کے ساتھ صحیح اور سالم ہی۔ اور مرنا یہہ کہ باطن کا خارج سے تعلق جاتا رہا ہے۔ ذی روح میں ایسی استعداد مذکور ہیں کہ اُسکے باطن کا تعلق کل دنیا سے ہی۔ جو کوئی خصوصیت مجھہ میں موجود ہی استقراءً اُسکا جواب نیچر میں موجود ہی۔ انسان خود میں کافی اور کامل نہیں ہی بلکہ محتاج بالغیر ہی۔ جسقدر اُسکا تعلق خارجی چیزوں سے صحیح واقع ہوتا ہی اسیقدر وہ زیادہ جیتا ہی اور جسقدر اُنکے ساتھہ کم تعلق قایم ہی اُسیقدر وہ مرا ہوا شمار ہوگا۔ نہ صرف اندھا ہی دنیاء عینی کی طرف سے مردہ ہی بلکہ ہم تم بمقابلہ علم سے بے بہرہ رہنے میں مردہ ہیں۔ کوئی ہم میں سے زیادہ جی رہا ہی اور کوئی کم۔ اسی طرح ایک نفسانی آدمی جو خدا کو چھوڑ کر دنیا میں محو ہی اور دنیا ہی اُسکا کھانا پینا ہی تو وہ روح کی طرف سے مردہ ہی۔ مسیح خداوند نے فرمایا کہ میں آیا ہوں تاکہ وہ زندگی پاویں اور زیادہ زندگی حاصل کریں۔ نیچر کے ذی جان طبقہ میں ہم کو زندگی کی حرکت کی کم و بیشی نظر آتی ہی۔ بعض ادنےٰ جانوں میں محسوسات کی کمی ہی اور شعور کی بھی کمی پائی جاتی ہی۔ انسانی طبقہ میں ایک انسان دوسرے سے زیادہ جان رکھتا ہوا نظر آتا ہی اور دوسرے میں ضعف طاری ہی۔ بحیثیت مجموعی بعض اقوام زندہ دل اور مستعد نظر آتی ہیں اور بعض میں افسردگی چھائی ہوئی ہی اور پست ہمتی اُنکے رگ و پئے میں سرایت کر گئی ہی۔ شخصی طور پر کسی کو کند ذہن یا کندہ ناتراش بنایا جاتا ہی۔ کسی کی جذبات کی کمی کی وجہ سے اُن کو سرد مہر کہا جاتا ہی۔ بعض کے ارادوں میں نقاہت ہی۔ بعض کی حرکات باطنی مردہ ہیں۔ اس طرح سے حُسن و قبح پر کہتے ہوئے ہمارا مطلب یہہ ہوتا ہی کہ فلاں فلاں شخص میں جان کی بہتایت ہی اور فلاں فلاں شخص میں اُس کی کمی ہی۔ اگر کوئی حُب وطن میں جور اور محبت قومی میں سرشار

نظر آتا ہی تو وہ ایسا شخص ہی جس میں دم اور جان ہی یہہ تو مشاہدہ کی بات ہی لیکن مسیحی تعلیم تاکید
کرتی ہی کہ نہ صرف زندگی حاصل کرو بلکہ زیادہ حاصل کرو۔ چنانچہ مسیحی تواریخ مسیحی زندگی کی تواریخ
ہی۔ مسیحی زندگی کا دائرہ اِسقدر وسیع ہی کہ دونوں عالموں کو گھیرا ہوا ہی۔ وہ زندگی قابلیتوں
کے اظہار کا نظارہ ہی۔ دینی فرایض کی ادائیگی میں اُس نے نہ صرف عقل سے کام لیا ہے بلکہ
ساتھ ہی حرکاتِ باطنی اور جذبات بھی مثل تار کے سُر کے گونجے ہیں۔ اگر خدا کو پیار کیا ہی تو سارے
دل اور ساری جان اور سارے بل اور ساری سمجھ سے۔ خدا کی اطاعت میں اپنے ذاتی نفع
و نقصان کو خیرباد کہکے دینی مقاصد پر قربان کر دیا ہی۔ اگر نوع انسان کی طرف رجوع کیا ہی تو
اخوت اور ہمدردی نے مسیحیوں کو دنیا کے تمام حصّوں پر بکھرا دیا ہی جیسے سیسموگراف دور
دراز زلزلوں کے صدموں کو محسوس کرتا ہی ویسے ہی مسیحی جماعت کے دلکا تھرمامیٹر دنیا کے
ایک سرے سے دوسرے سرے کی حرکت محسوس کرتا ہی۔ اور سچّائی کے فروغ میں اور جھوٹ کے
استیصال میں اور ظلم کے فرد کرنے میں اُس کی رگِ حمیّت اور رگِ غیرت اور رگِ درد حرکت
کرنے لگ جاتی ہی۔ دنیا بھر میں مشنری کام کا جاری ہونا یہہ دکھاتا ہی کہ مسیحیت شخصی اور
من حیث القوم زندگی میں ایک ایسی روح پھونک دیتی ہی کہ وہ ہر انسان کو خواہ کسی ملک
کا باشندہ اور کتنا ہی رذیل اور دور افتادہ کیوں نہ ہو خدائی ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتی ہے
اور اُسکے اُٹھانے کی کوشش کرتی ہی۔ مسیحی زندگی کے فیض کے اُمڈے ہوئے دریا نے قوموں
کی کایا پلٹ ڈالی ہی اور اُنکی روحوں کو تازہ اور دلوں کو زندہ کر ڈالا ہی چھوٹی چھوٹی مسیحی
گروہوں نے سچّائی کے پاس میں وطن سے لاوطن ہونا گوارا کیا ہی اور راہ کی دشواریاں اُنکی
شاہبازِ ہمت کے آگے تازیانہ کا کام دے گئیں ہیں۔ اصول اور قاعدہ کی پابندی میں وہ

سچّائی کے ہیرو بلکہ اسکی خاطر شہید بھی ہوئے لیکن یورپ کی بڑی بڑی قوموں کی بنیاد ڈالگئے
اس بیان سے ثابت ہوا کہ انسان یا تو بے حد جی سکتا ہی یا بے حد مر سکتا ہی۔ لہذا اغلب ہی کہ وہ
خدا میں ہو کر ہمیشہ جی سکتا ہی اور یا خدا کے بغیر ہمیشہ کی موت کا لقمہ ہو سکتا ہی۔ انجیلی کلام کے مطابق
بہشت کی نعمت ہمیشہ کی زندگی ہی اور دوزخ کی سزا ہمیشہ کی موت ہی۔ ایک روشنی کی جگہ ہی
دوسری تاریکی ہی ایک میں زندگی ہی دوسرے میں موت۔ تناسخ کی تعلیم اسکے برعکس انسان
کو فیٹیلسٹ یا شامت اعمال کا پتلہ بناتی ہی۔ وہ کبھی بندھ میں پھنستا ہی اور کبھی بندھ سے چھٹتا
ہی۔ پھر تناسخ کے ماننے سے انسانی زندگی ایک شخصی زندگی ہوتی ہے کیونکہ اُس میں کوئی
علت غائی نہیں ہی۔ کرنا اور بھوگنا یہی اُسکا فطرتی تقاضا ہی۔ کرنے میں سوآدھین اور
بھوگنے میں اپشور آدھین ہی۔ خدا میرے لئے کچھ نہیں ہی۔ یہہ سچ ہی کہ منش کرم کرنے
میں سوآدھین ہی لیکن اِسکے یہہ معنے ہیں کہ وہ نیکی بھی کر سکتا ہی اور بدی بھی لیکن جب بااختیار
ہو کر انسان نے اپنے ارادہ سے ایک راستہ چنا جو خلاف شریعت ہی اور اس میں چلا تب وہ
دوسرے راستہ کے چننے میں سوآدھین نہیں رہا کیونکہ بدی نے اُس کی سیرت و خصلت میں
ایسا اثر ڈالا ہی کہ نیکی کرنے میں اُسکا ارادہ خستہ اور کمزور ہو گیا ہی گو اُس میں طبعی لیاقت موجود
بھی ہی لیکن اخلاقی طاقت بدی کرنے سے کمزور ہو گئی ہی لہذا تناسخ کے رو سے اُس کا چھٹکارا
ناممکن ہی۔ اُسکے مطابق اگر جیو اپاسنا سنتی اور یوگ بھیاس کریگا تو مکتی ہوگی اگر کچھ اور تو بندھ
میں آویگا تناسخ کی فلسفہ کرم کی فلسفہ ہی کرنی جیو کو مکت جیو بناتی ہی اور کرنی ہی اسکو بندھ میں پھانستی
ہی۔ مسیحی تعلیم انسان کی گناہی حالت کو دیکھتی ہی اور اسبات پر اُس کی تاکید ہی کہ انسان کو ہونا کیا
چاہئے۔ انسان تعلقات سے وابستہ ہی ان کے چُننے میں اُسکا کرنا منحصر ہی۔ اگر اُسکا تعلق محض

دنیا سے ہی تو وہ نفسانی ہی اور اُسکے کام نفسانی ہیں۔ انسانی کرم کے اصول نشو و نما کی صورت میں ظہور پذیر ہوتے ہیں نہ یہہ کہ جیسا وہ کرتا ہی ویسا بھوگتا ہی بلکہ یہہ کہ جن تعلقات سے وہ وابستہ ہی ویسی وہ بھوگتا ہی۔ انسان کے دل میں اخلاقی دوئی پائی جاتی ہی وہ جانتا تو ہی کہ کیا کرنا چاہئے مگر واقعی اُس پر عمل کرنے سے جی چراتا ہی۔ اگر انسان نے اپنے تمام تعلقات سے خدا کو جُدا کر رکھا ہی تو اُس کی نیکی خدا پسند نیکی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جیسے درخت جب اُس کی جڑ زمین میں قائم ہی تو وہ بڑھتا۔ پھولتا پھلتا ہی ویسا ہی جب انسان کا تعلق محض دنیا سے ہی تو وہ جیتا تو ہی بہت کچھ کرتا بھی ہی لیکن اُس کے کرم اور پھل نفسانی ہیں اور خدا کے ساتھ تعلق قایم نہ ہونے کی وجہ سے مردہ ہی۔ لیکن اگر دنیا میں رہکر وہ اپنا تعلق خدا میں قائم رکھتا ہی تو وہ روحانی ہی اور اُس کے کرم زندہ کرم ہیں۔ اور وہ اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہی۔ مسیح نے کہا "مجھ میں قایم ہو اور میں تم میں جس طرح کہ ڈالی آپ سے میوہ نہیں لا سکتی مگر جب کہ وہ انگور کے درخت میں قایم ہو اسی طرح تم بھی نہیں مگر جب کہ مجھ میں قایم ہو"۔ بھوگنا ہی انسان کے فعل کا نتیجہ نہیں ہی بلکہ اپنی پوری حیثیت کو پراپت ہونا اُسکی غایت ہی۔ وہ فعل مختار تو ہی لیکن پابند شریعت ہی جو واجب فعل کی تکمیل کا حکم با سیاست کرتی ہی نہ اسلئے کہ یہہ کرنے سے ہماری خواہشات سُکھ بھوگنے کی پوری ہونگی بلکہ اس لئے کہ فعل بذاتہ واجب فعل ہی جسکی بدولت انسان اپنے اصلی مرتبہ کو پہنچتا ہی اور خدا کی قربت و صحبت کے لائق بنتا ہی۔ اُسکا اپنے کمال پر پہنچنا اشرف المخلوقات کے درجہ پر ممتاز ہوتا ہی اور اُس درمقصد کا حاصل کرنا عین اُس کی زندگی کی علت غائی ہی۔ اور جب خدا کا عرفان حقیقی اُسکو ہوتا ہی تو وہ اپنے کل قوائے کو کام میں لاتا ہی اور اُس کو اپنے سارے دل اور ساری جان اور زور و سمجھ سے پیار کرتا ہی اور اپنے ابنائے جنس کو اپنے جیسا۔ پھر تناسخ

نہ صرف کرموں کی فلسفہ ہی بلکہ دُکھ سُکھ کی فلسفہ ہی جو کرموں کا پھل ہی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند مسیح کی زندگی افلاس کی زندگی تھی۔ گو وہ غنی تھا پر ہماری خاطر غریب بنا۔ اس کی زندگی سادہ تھی اُس کو سر رکھنے کی بھی جگہ میسر نہیں تھی۔ اس کی خوراک اور لباس اور طرز و انداز سب سادہ تھے۔ تاہم وہ ایسا محتاج نہ تھا کہ گھر گھر دریوزہ گری کرے۔ وہ اپنی کمائی کی روکھی سوکھی کھاکر گذارہ کرتا تھا لیکن قناعت کا پتلہ تھا۔ بلکہ اپنے قلیل اندوختہ سے حتے الوسع دینی و سوشل اور ملکی ضروریات بھی بہم پہنچاتا تھا۔ پھر اُس کی زندگی محنت و کلفت کی زندگی تھی۔ ایام طفولیت سے لیکر محنت سے اپنی اور ماں کی ضروریات پوری کرتا رہا۔ اور بعد میں دوسروں کی خدمت کا بھی بیڑا اُٹھایا جس نے اس کی خدمت کو طلب کیا بلا چون و چرا گیا اور خدمت ادا کی تعلیم دینا۔ وعظ کرنا۔ رحمت کے کاموں میں مصروف رہنا یہہ اس کے رات و دن کا کام تھا اُسنے جہلا او گھمنڈیوں کی بے صبری اور تکرار اور دوستوں کی بے وفائی کی برداشت کی۔ انبوہ کی مطلبی اور یار بار کی اصرار توجہ سے مطلق نہیں جھجکا یا گھبرایا۔ اُس کو اکثر روٹی کھانے کا بھی وقت ہاتھ نہیں لگتا تھا۔ وہ رات کی تنہائی میں بھی دعا میں مصروف رہتا ہی۔ بایں ہمہ جفاکشی اور محنت اس کی زندگی میں صحت تھی۔ وہ دوسروں کو شفا بخشتا رہا مگر خود کبھی بیمار نہیں ہوا۔ وہ ہمارے بدلہ گھایل کیا گیا۔ ہمارے گناہوں کی خاطر وہ کچلا گیا کیونکہ دوسرونکا درد اُس نے اپنا درد سمجھا۔ ہماری کمزوریوں سے وہ متاثر ہوا۔ اور ہمارے غم میں وہ غمگسار ہوا۔ نہ صرف اس کی زندگی میں صحت تھی بلکہ اُس کی نیند چین و آرام کی نیند تھی حتّے کہ کشتی کے صحن پر سخت سے سخت طوفان میں جب لہروں کے تھپیڑے کشتی کو توڑے ڈالتے تھے اور موجوں کی گرداب میں وہ ڈگمگاتی ہی وہ آرام کی نیند سو رہا ہی۔ اسکے علاوہ وہ مرد غمناک تھا۔ لیکن اُسکا دکھ گناہ کا دکھ نہیں تھا

اُسکا درد ہمدردی کا درد تھا۔ اُس کو فکروفاقہ دوسروں کی خاطر تھا۔ وہ یروسلم پر رویا وہ لعزر
کی قبر پر رویا۔ وہ انسان کی سخت دلی اور بربادی پر رویا کیا لیکن ایسے دُکھ کو کرموں کا پھل
بھوگنا کون کہہ سکتا ہی۔ دکھ گناہ کا ہوتا ہی۔ گناہ بےچینی اور بےتابی پیدا کرتا ہی۔ گناہ تمام امراض کی ما ہی
دکھ ناقابل معاف جرائم کا ہوتا ہی۔ دکھ خدا کی جدائی محسوس کرکے ہوتا ہی۔ دکھ مایوسی کی حالت میں
ہوتا ہی جب گناہ کی مرض کا کوئی علاج نہیں سوجھتا۔ خداوند مسیح کا سینہ صاف تھا۔ اُس کی
ضمیر پر کوئی داغ گناہ کا نہ تھا۔ اُس کی طبیعت میں استقلال تھا۔ اُسکا باطن شستہ اور پاک
تھا۔ اُسکے چہرہ پر بشاشت اور چین کے آثار نمودار تھے۔ اُسکے مزاج میں صبروشکیب تھا۔
ہر ایک عادت جو شان رکھتی تھی ہر ایک جوہر جو پاکیزہ تھا ہر ایک وصف جس میں بقا تھی وہ
سب اسکے زیور تھے جنسے باہر واندر وہ مزین تھا۔ ایسے شخص کو کرموں کا پتلہ بنانا سچائی کا خون
کرنا ہی۔ پھر تناسخ کی تعلیم کا نتیجہ یہہ ہی کہ وہ انسان کو منفردی یا محض شخصی بناتی ہی۔ مہابھارت
کی لڑائی کے متعلق کہا جاتا ہی کہ جب ارجن اپنی جنگی رتھ پر سوار ہو میدان جنگ میں گیا۔ اُسنے
طرفین کے بڑے بڑے سُورما اور بہادر جمع دیکھے اور اپنے چچازاد بھائیوں کی طرف خیال کیا
کہ ہمارے خون کے پیاسے بھی موجود ہیں۔ فوراً تیروکمان زمین پر رکھدی اور مہاراج سری کرشن
سے گویا ہوا کہ کیا دنیوی جذبات کے واسطے میں اپنے بھائیوں سے لڑوں؟ یہہ تو دھرم کے خلاف
ہی۔ مہاراج نے جب یہہ کلام سنا تو دل میں افسوس کیا مگر سوچ کر یہہ جواب دیا کہ ای ارجن یہہ
بات محض نامردی کی ہی اور خلاف دھرم نہیں ہی۔ بھائیوں کی محبت جو تم کو سوجھی ہی یہہ بالکل
بے اصل ہی کیونکہ دنیا میں انسان کتنے جنم لیتا ہی اس کے حساب سے کون کِسکا بھائی
اور کون کِسکا چچا۔ تناسخ کی تعلیم انسان کو انسان سے جُدا کرتی ہی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسان

اِس دنیا میں صرف اپنے ہی لئے نہیں جیتا وہ بھوگنے ہی کی خاطر اسی دنیا میں نہیں آیا
بلکہ اپنی زندگی کا کچھ حصہ سوسائٹی کے تفویض کرتا ہی تاکہ اُس کے زیر تابع ہوکر ضابطہ کو
قائم رکھے۔ تناسخ کی تعلیم کے مطابق نیچر میں کوئی انجام نہیں پایا جاتا ہی نیچر کی یہی صورت
ہی اور یہی رہیگی۔ لیکن دیکھا جاتا ہی کہ نیچر کی موجودہ حالت میں بہت کچھ گڈمڈی اور ابتری
نظر آتی ہی۔ اس میں نیکی اور بدی دونوں شامل ہیں۔ جو انسان بداحتیاطی اور غفلت
سے اپنے قیمتی وقت کو ضایع کرتا ہی وہ اپنے لئے دُکھ پیدا کرتا ہی اور جو دوراندیشی سے کام
لیتا ہی وہ سُکھ کا سامان مہیا کرتا ہی۔ اسی طرح سوسائٹی بھی پبلک کے حقوق کی محافظ
ہی۔ اس سے ثابت ہی کہ ہر ایک فرد جدا جدا اور اجماعی حیثیت میں اپنے کئے ہی کے مطابق
بھوگ نہیں رہے ہیں بلکہ خاص ایک انجام کے پورا کرنے میں مقرر ہیں۔ پرمیشور نہ صرف
ایک عادل ہونے کی حیثیت میں ہم کو دکھ اور سکھ دے رہا ہی بلکہ اُسکا سلوک اپنی مخلوق
سے نیک مطلوب ہی۔ وہ بُرے اور بھلے دونوں پر بلالحاظ ہمارے کرموں کے یکساں طور
پر اپنی باران رحمت برساتا ہی۔ وہ نیچر کا نہ صرف خالق ہی بلکہ مالک بھی وہ نہ صرف ایک
صانع عظیم ہی نہ صرف حلیم کل بلکہ اس موجودات کا زندہ حاکم اور ناظم بھی ہی۔ اور انجام اور
غائت کے لحاظ سے وہ نیچر کو زیر اہتمام رکھتا ہوا دکھائی دیتا ہی۔ وہ انسان کی باوصف
اِس کے کہ وہ فعل مختار ہی۔ بےطرح آزادی کے روکنے کے لئے بہت سی سزائیں اور
مزاحمتیں حائل کرتا ہی۔ اگر یہہ نہ کرے تو کل سوسائٹیں دنیا کی گناہ کے غلبہ کی وجہ سے
درہم برہم ہو جائیں۔ نہ صرف خدا ہی انسان کو گناہ کے بُرے نتیجوں سے روکتا ہے بلکہ
سوسائٹیں بھی۔ کیونکہ گناہ جو کیا جاتا ہی چھپ کر کیا جاتا ہی علانیہ نہیں۔ اور جس جماعت یا قوم

میں تاریکی آجاتی ہے وہ دوسرے کے قبضہ میں آکر بُرے نتیجوں سے بچائی جاتی ہو۔
انسان فعل مختار تو ہے لیکن خدا کے انجام میں اُس کا دخل نہیں ہے بلکہ اُس کے
ترقی دینے میں خدا کی خدمت کرنا اُسکا فرض منصبی ہو لیکن نیچر اپنے انجام تک تا حال نہیں پہنچا
ہے اُس میں ابھی تک بہت کچھ بدی کا غلبہ ہے لیکن بدی کا تسلط دیرپا نہیں ہو چنانچہ
دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ قوم جو تہذیب اور تمدن اور معاشرت اور اخلاق میں دوسری
قوموں پر فوق رکھتی ہو وہ راج کرتی ہو اور اُسکے زیر حکومت رہنا اُس قوم کو جس میں ظلم اور
تعدی کا بازار گرم ہو پسند ہوتا ہو۔ پس جس حال کہ موجودہ دنیا میں نیک و بد ملے جُلے رہتے
ہیں بلکہ بُروں کی تعداد و شمار میں زیادہ نظر آتی ہو اور بدی کا غلبہ نظر آتا ہو تو اگر پرمیشور جو
دنیا کا ناظم و حاکم ہو اور اُس سے اپنا تعلق منقطع نہیں کر لیا ہو بلکہ اُسکا محافظ اور نگران ہو
تو اغلب بلکہ یقینی ہو کہ وہ ایک جماعت نیکوں کی قایم کر رہا ہو۔ اور یہہ بھی اغلب ہو کہ آئے
دن وہ جماعت راستبازی اور انصاف سچائی اور نیکی کی بدولت کل دیگر جماعتوں پر غالب
ہوگی اور تب نیکی کا غلبہ ہوگا اور بدی معدوم ہوگی۔ اُس نیکوں کی گروہ کا نام الہامی اصطلاح
میں کلیسیہ کہا گیا ہو اور اُن کے رہایشی مکان کا نام آسمان ہو جس میں خدا کا تعلق ہمارے
ساتھ بہ رشتہ باپ کے ہوگا اور ہم آپس میں بھائی بھائی ہونگے۔ چنانچہ مرقوم ہو کہ خدا نے ایک
ہی لہو سے آدمیوں کی سب قومیں تمام زمین کی سطح پر بسنے کے لئے پیدا کیں۔ اگر ہمارے قالب
کرموں کا پھل ہیں تو اس یقین سے خاندانوں کا خون کیا جاتا ہو۔ وہی قول مہاراج کرشن جی
کا صادق ٹھیرتا ہو کہ انیک جنموں کے لحاظ سے کون کسکا بھائی اور کون کسکا چچا۔ لیکن
مسیحیت خاندانی رشتہ کو متبرک قرار دیتی ہو۔ ماں باپ کا رشتہ متبرک ہو کیونکہ وہ علامت

کے طور پر اُس رشتہ کو دکھاتا ہو جو تمام اقوام کا خدا کے ساتھ ہو جو ہم سب کا پتا ہے۔
نکاحی رشتہ متبرک ہو کیونکہ وہ اُس اتحاد کو ظاہر کرتا ہو جو خدا اور دنیا کی جماعتوں میں ہونا
چاہئیے۔ قوموں کا وجود متبرک ہو کیونکہ وہ ظاہر کرتا ہو کہ تمام نوع انسان ملکر ایک ہی خاندان
کا مجموعہ ہے جس میں یونانی یا بربری اور غلام اور آزاد نیچ اور اونچ اور آریہ اور ملیچھ میں
کوئی تمیز نہیں ہو۔ مسیحیت گرے ہوئے کو اُٹھاتی ہو اور اونچے سر کو جھکاتی ہو۔ مسیحیت
قوموں کو ایک ہی جوئے تلے لاتی ہو جو فرزندیت کا جوا ہو۔ اور اسلئے کہ آزادی کا جوا ہو
اور محبت کی اُس پر مہر ہو لوگ کشاں کشاں اس کی طرف دوڑتے ہیں۔ اِسیکا نام کلیسیائے
جامع ہو جس کے شرکا تمام اُمتیں تمام اقوام اور تمام زبانیں ہیں۔ اُس کی بنیاد روحانی
اصول پر رکھی گئی ہو جسکو زمانوں کی گردش اور خلقت کی بے ثباتی جنبش نہیں دے سکتی
اور جس کے بخت کا ستارا آئے دن تمام افقِ عالم کو منور کر ڈالیگا +

تناسخ کا کھنڈن اور مسیحیت کا منڈن

لکچر دوسرا

"تناسخ کی فلسفہ سکھہ دکھہ کا بھوگنا انسانی زندگی کا مدعا بتاتی ہی جس میں سکھہ ہو وہ سورگ ہی اسکے خلاف دکھہ نرک ہی- جسم کے اندر جیو سکھہ دکھہ بھوگتا ہی- مکتی کے اندر وہ بہت سکھہ بھوگتا ہی- مکت جیو محیط کل برھم کے اندر اپنی خوشی کے موافق گھومتا ہی- پاک علم سے تمام کائنات کو دیکھتا ہی- جس قدر گیان بڑھتا ہی- اسکو اسی قدر زیادہ آنند ہوتا ہی- سملاس نواں- اس کا نام غیر معمولی سکھہ یا سورگ ہی- اور محسوسات کی خواہش میں پھنس کر خاص دکھہ بھوگنا نرک کہلاتا ہی- مکت جیو کو سب خواہشیں حاصل ہوتی ہیں- جو جو ارادہ میں آتا وہ وہ عالم اور وہ وہ خواہش حاصل ہو جاتی ہی- اور وہ مکت جیو جسم کثیف کو چھوڑ کر جسم ارادی سے آکاش کے اندر پرمیشور میں پھرتے ہیں- جسم والے جیو دکھہ سے بری نہیں ہو سکتے- مرنا کثیف جسم کا دھرم یا خاصہ ہی- یہہ جسم جیو آتما کے رہنے کا مقام ہی اس واسطے دکھہ سکھہ میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں الخ..."

تناسخ کی تعلیم نے پرمیشور کو تو جنم مرن۔ بڑھاپے۔ غم بھوک۔ پیاس وغیرہ سے بری کر دیا ہی
لیکن جیو کو دائمی بندش اور رہائی کا عجیب پُتلا بنا رکھا ہی۔ خدا اُس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا
کیونکہ جیو بھی ازلی ہے۔ اور نہ خُدا جیو کے لئے کچھ ہو سکتا ہی۔ وہ پڑا پرمیشور مین گھومتا پھرے
لیکن بار بار بندھن میں آنا اُس کا دھرم ہی۔ بائبل کی تعلیم سے ظاہر ہی کہ بنی انسان جو روح
اور جسم کی مجموعی شکل کا نام ہی۔ اپنے روحانی خواص میں خدا کی صورت پر بنایا گیا ہی اور جسم
کے لحاظ سے مٹی کا بنا ہوا ہی۔ وہ خدا کی مخلوق ہی۔ اُس کو یہہ رتبہ اور پایہ حاصل ہی کہ موجودات
کو متبدل کر کے اپنے کام میں لاوے اور اپنے بدنی لباس کو جو از خود جوہر ظلمانی ہی۔ اپنے جوہر
نُورانی سے جلالی بناوے۔ بدکرتوتوں سے انسان نے اپنے بدن کو حیوانی بنا چھوڑا ہی۔
لیکن پاکیزہ گفتار و رفتار سے وہ اُس بدن میں نُورانی زندگی پھونکتا ہی۔ لیکن تناسخ کی تعلیم
جیو کا بدن میں آنا بندھن بتاتی ہی۔

اس تعلیم کے مطابق جیو کا اس دُنیا میں آنا ایک بندھن ہی۔ انسانی زندگی ایک رازِ سربستہ معمّا
ہی۔ انسانی زندگی کا مقصد اور انجام کیا ہی؟ ہم کو اپنی نسبت یہہ دریافت کرنا کہ میں کیا ہوں۔
اِس دنیا میں میں کیوں آیا۔ مجھے کیا ہونا چاہیئے نہائت ہی ضروری ہی۔ کیا پرمیشور کا یہی کام
ہی کہ وہ جیو کے کرموں کے سبب اُسکو مختلف جنموں کی سزا بھگتائے اور اسکے علاوہ اُس کا
دُنیا میں موجود ہونا اور کچھ مطلب نہیں رکھتا؟ حکیم سقراط کا قول تھا۔ کہ اے آدمی تو اپنے
آپ کو جان۔ اُس نے اور اُس کے ہمعصر ساتھیوں نے اُسپر بہت کچھ غور و خوض کیا لیکن
سقراط انسان کے مقصد اور انجام کو نہیں بتا سکا۔ اُس کی تعلیم سے ایک قسم کی سچّائی کا پاس تو
ہوا۔ لیکن اُس سے انسانی علّت غائی کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا کیونکہ وہ انسانی فطرت کی تہ تک تو وہ نہیں

لگا سکا اور جب علّت غائی معلوم نہ ہوئی تو زندگی کی صحیح قدر بھی نہ ہو سکی۔ یہی حال پنڈت دیانند
صاحب کی تعلیم کا ہی۔ انسان کی زندگی ان کے مطابق کرم کا پُتلہ ہی۔ یعنے ایک گھومتا ہوا چکّر
ہی جسکو قیام نہیں۔ اُس کا دُنیا میں آنا ایک بندھن ہی۔ فرض کرو دنیا کے سفر میں ہم کو ایک شخص
ملے جو کسی وقت میں بادشاہ تھا۔ لیکن اب ایک ایسی جگہ میں رکھا گیا ہی جہاں اُس کو پُوری
آزادی میسّر نہیں۔ وہ اپنی حد میں جابجا پھرتا ہی اُس کے آرام و آسائش کے لیے حسب حیثیت
سب کچھ مہیّا ہی۔ نوکر چاکر اُسکی عزّت و قدر کرتے ہیں۔ اُس کے طرز انداز میں شاہانہ خو پائی جاتی ہی
لیکن باوصف اس کے وہ مقید نظر آتا ہی اُسکے چاروں طرف سنتری نگرانی کرتے ہیں۔ اُسکا ہر ایک
قدم اُسکی ہر ایک بول چال زیر نگاہ ہی اُس کا پورا اعتبار نہیں کیا جاتا ہی۔ اگر وہ حد سے تجاوز کرنا
چاہے تو نیزہ و شمشیر اُس کو سمجھایا جاتا ہی۔ ایسے شخص کو دیکھ کر کیا نتیجہ نکالا جاویگا؟ یہی کہ کسی وقت
یہہ شخص راج کرتا بادشاہ تھا۔ لیکن اب بندش میں ہی۔ اسی طرح اِس دُنیا کو دیکھ کر ہم کو انسان
کی حالت نظر آتی ہی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس دنیا میں اِنسان موجود ہی اس میں دانائی اور حکمت
کے آثار جابجا نظر آتے ہیں۔ اُس کے لئے سب سامان آرام و آسائش کے موجود ہیں اس
دنیا کی حد میں وہ جو چاہے سو کر سکتا ہی۔ دنیا کے ہر ایک راستہ سے اُس کی گذر ہی دنیا کا کوئی بھی
ایسا حصّہ نہیں جہاں وہ موجود نہیں ہی باوصف اس کے وہ ایسی حکومت کے زیر نگراں ہی جس میں
اُس کو ہر ایک قدم اُٹھانے پر بندش نظر آتی ہی بیجا تجاوز پر سدھار کی چابک ہر وقت موجود رہتی
ہی۔ سزائیں۔ رکاوٹیں سدّ راہ ہوتی ہیں۔ وہ آزاد تو نظر آتا ہی مگر ہر حالت میں جو چاہتا ہی سو نہیں
کر سکتا ہی۔ وہ بڑے بڑے منصوبے باندھتا ہی لیکن غائب کا ہاتھ اُس کے منصوبوں کو توڑ کر عین
اُس کی منشاء کے برعکس نتیجہ پیدا کرتا ہی اُسکو کسی نے گھیرا ہوا ہی اُس کے کام میں مزاحمت پیش ہوتی ہی

اُسکو سزا ملتی ہی۔ وہ بُرائی کرنے سے روکا جاتا ہی گویا دُنیا میں بادشاہ کی حیثیت میں بھی ہے حالانکہ وہ سب کا سرتاج اور خلیفہ نظر آتا ہی لیکن گناہ کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بیڑیوں میں مبتلا پاتا ہی تخت کے بجائے وہ زمین کی پابوس اور پائمال ہی۔ ایک طرف تو اُس کی شرافت نظر آتی ہی کہ بیشک وہ اشرف المخلوقات ہی۔ نیچر اُس کے تابع ہی حیوان اور پرند اُس کی سُنتا اور مانتا ہی سب سے وہ خدمت لے رہا ہی عقل کا پُتلہ نظر آتا ہی لیکن تاہم وہ زیرنگراں ہی اُس کی حالت ایسی ہی گویا خدا کو اُس کا اعتبار نہیں ہی۔ خدا کے سنتری جابجا موجود ہیں جو اُس کی نگرانی کرتے۔ اُسکو سزا دینے اور پابندی میں لاتے ہیں۔ اُسکی بے طرح آزادی خباثت اور شرارت اور بدی ہی۔ ایسی حالت میں وہ حیوان سے بھی گیا گذرا نظر آتا ہی یہہ کیا معمّا ہی کہ ایک پہلو سے تو وہ راجہ نظر آتا ہی اور دوسرے پہلو سے حیوان؟ اسکا یہی جواب ہی کہ نہ وہ حیوان ہی اور نہ راجہ رہا ہی۔ بلکہ راجہ تھا لیکن اب زیرنگراں ہی۔ اب یہہ فرض کرو کہ دنیا میں سچائی اور راستی کا تسلط ہو جاوے۔ انسان سے حیوانی خباثت اور خود غرضی اور گناہ بالکل دور ہو جاوے۔ محض سچّائی اور بھلائی اور دوسروں کی خدمت کا پاس ہو اور خدا کی پوری اطاعت اور فرمانبرداری بھی ہو تو اس دُنیا سے دُکھہ کافور ہو جائیگا۔ بدی جاتی رہیگی اور اِنسان حسب حیثیت سرتاج اور خلیفہ نظر آویگا۔ تو اس صورت میں انسان کی موجودہ زندگی میں ہم کو علّت غائی نظر آویگی۔ اگر دُکھہ اور جدائی اور موت ہی تو بغیر وجہ نہیں ہی گناہ کے ہونے سے اِنسان اس دنیا میں ایک مجرم کی صورت میں نظر آتا ہی اور دُکھہ اور سزائیں اور سدھار کی تجاویز اس امر پر دال ہیں کہ خدا انسان کی بہبودی اس امر پر دیکھتا ہی کہ وہ شریعت کا پابند اور عبادت کرنیوالا بندہ ہو۔ اس لیئے جیو کا دُنیا میں آنا ایک بندھن نہیں جو کرموں انوسار ہم کو حاصل ہوا ہی بلکہ دنیا کا دُکھہ اور موت انگشت شہادت کی طرح آئندہ تاریکی اور موت کو دکھاتا ہی جس میں خدا کا انصاف ہم کو غضب کی تلوار کے

نیچے لاویگا اور دنیا کا سُکھہ اُس فضل و رحم کو دکھاتا ہی جس کے آسرے میں از راہ توبہ انسان زندگی کا مُنہہ دیکھیگا +

مسیح نے انسانی جامہ پہنکر انسانی زندگی کی علّت غائی کو ظاہر کیا ہی کہ انسان ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہو سکتا ہی۔ دُنیا تو گمراہی میں چلکر بُدھا اور یاس کے گڑھے میں جا پڑی تھی۔ لیکن مسیح نے اُس پتا کو دکھایا جو آسمان پر ہی۔ اُس نے دکھایا کہ زمانوں کے مصائب اور تکالیف اور آزمائشیں انجام کار ہماری خوشی اور چین اور دائمی سُکھہ کا باعث ہونگی اُس نے ظاہر کیا کہ یہہ دنیا ایک مسافرت ہی اور ہمارا منزلِ مقصود آسمان ہی جب زندگی کا انجام معلوم ہوا تو اُسکی حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ اب ہم واقعی کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ جب ہمیشہ کی زندگی کو ہم نے اپنا خضرِ راہ بنایا تو اُسکی روشنی میں ہم موجودہ زمانوں کے حادثات جو وقوع میں آتے ہیں سبق لے سکتے ہیں۔ مسیح نے شریعت کو اپنی انسانی زندگی میں پُورا کیا۔ اُس کی زندگی سے ہم اپنی کا موازنہ کرکے دیکھہ سکتے ہیں کہ ہم میں کیا کمی ہی اور واقعی کیا ہونا چاہیئے۔ اگر ہمارا سینہ صاف ہوتا اور زندگی پاکیزہ تو ہم میں صحت ہوتی اور ہمارے کل قوائے ذہنی ہر ایک حقیقت کو صحیح دیکھتے۔ ہم سب چیزوں پر قابض ہوتے اور حسب حیثیت صحیح علم پر حاوی ہوتے اور سب سے خدمت لیتے لیکن گُناہ کی وجہ سے ہماری ترقی ٹیڑھی واقع ہوئی ہی اور ہماری مذہبی تاریخ بگڑے کانشنس کے ظہور کا ایک سلسلۂ واقعات ہی اور دُکھہ اور موت سب پر لاحق ہی +

مسیح میں ہم کو اپنی موجودہ حالت معلوم ہو جاتی ہی ہم کو گناہ کا دُکھہ محسوس ہونے اور خباثت نظر آنے لگتی ہی۔ ہم دیکھتے ہیں ہم کیا ہیں اور کیا ہونا چاہیئے۔ مسیح میں ہم اپنی انسانی ذات کو حقیر ہرگز نہیں سمجھہ سکتے۔ ہاں گُناہ کو حقیر سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ موت حیوان کو زیبا ہو تو ہو۔ نسبت اُسکی ایک

حیوان کا قائم رہنا مفید نظر نہ آوے جیسے یکے بعد دیگرے اُس کا سلسلۂ نسل کا لیکن موت انسان کا طبعی حصہ نہیں ہی۔ مسیح میں آلہی شریعت ہمارے لئے ایک شیشہ کا کام دیتی ہی جس میں ہم کو گناہ کی خباثت اور اُس کا ہماری ذات میں غیر طبعی ہونا نظر آتا ہی اُس کی روشنی سے ہم کو اپنی تاریکی نظر آنے لگتی ہے تب ہم کو محسوس ہوتا ہی کہ ہم کیا ہی بُرے ہیں اور گُناہ کیسی خبیث چیز ہی۔ تب دلدل میں رہنا ہم کو پسند نہیں ہوتا اور ہم نجات کا آسرا ڈھونڈھتے ہیں۔ اگر بقول تناسخ ہمارا دنیا میں دائمی آنا جانا ہی تو ہم نے نہ تو خدا کو جانا ہی اور نہ اپنی زندگی کی علت غائی کو جانا ہی۔ کیونکہ بقول تناسخ دنیا کا دُکھ اور سُکھ کرم انوسار ہی اور خدا کے انصاف پر مبنی ہی اور یہہ انصاف جاری ہی اور جاری رہیگا +

پھر بقول پنڈت موصوف جیو بندھن میں آکے دُکھ سُکھ کو بھوگتا ہی لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ دنیا میں دُکھ تو ہی۔ پر کیوں اتنا دُکھ ؟ اگر سدھار کے لئے تو انسان یہہ سبق تو بہت کم سیکھتا ہی بلکہ بیقراری بے چینی۔ بے صبری اور سخت دلی دُکھ کا زیادہ نتیجہ نظر آتا ہی اور اگر سدھار بھی ہی تو اُس کے لئے اتنا دُکھ اتنی بیماری اور موت اور پھر موت کا خوف اور یہہ سب پر یکساں کیوں ؟ اس کا جواب تناسخ کیا دیتا ہی ؟ محض یہہ کہ کرموں کا پھل اور بس حقیقت میں دنیا کے انتظام سے معلوم ہوتا ہی کہ خدا بدی کو رفع کرنا چاہتا ہی اور نیکی کا معاون ہی اور راستی اور سچائی کی حکومت کو قائم کریگا۔ خدا کی پاک ذات بدی سے خفگی ظاہر کرتی ہی اس لئے دنیا میں دُکھ ہی اور یہہ دُکھ ہمارے افعال کا نتیجہ ہی۔ لیکن دُکھ سے زیادہ بُرا گناہ ہی جو ہمارے میں راج کر رہا ہے اور سُکھ سے زیادہ بھلی چیز نیکی ہی جو انسان کا اصلی جوہر ہونا چاہیئے گویا دُکھ اور سُکھ دُنیا میں ایک آگاہی اور مہلت ہی کہ انسان اُس آنے والے غضب سے بچے جو انصاف کی بنیاد پر انسانی گناہ پر عائد ہوگا اور توبہ کی راہ

سے فضل کا ہاتھ پکڑے تاکہ زندگی کا وارث ہو۔ انصاف ایک عام مراد رکھتا ہی۔ اور ایک خاص۔ خاص تو یہہ کہ ہر ایک کو اپنے کئے کا ملنا۔ عام یہہ کہ پاکیزگی اور راستی کا تسلط قائم کرنا۔ خدا کی رحمت نے جو اُس کے پاکیزہ ارادہ کا اظہار ہی ایک اخلاقی حکومت قائم کی ہی جو اُس کے جلال کا اور مخلوق کی بہبودی کا باعث ہی لہذا انصاف اُس حکومت کے چلانے کے طریقہ کا اظہار ہی۔ جس میں ہر ایک سے اپنے کئے کے مطابق سلوک کیا جاتا ہی لیکن انجام اُسی حکومت کا جاری رکھتا ہی۔ سزا و جزا ظاہر کرتا ہی کہ وہ نیکی پسند کرتا ہی اور گناہ سے نفرت۔ اس لئے علاوہ موجودہ سزا و جزا کے جو نیکی اور بدی کی آگاہی دیتے ہیں۔ آئندہ عدالت ہوگی۔ موجودہ دُکھ اور سُکھ خدا کی رحمت پر مبنی ہی لیکن آئندہ انصاف ہوگا۔ مگر پنڈت موصوف جیو کا بدن میں آنا بندھن بتاتے ہیں یہہ بدن جو روح کے انصال اور پیوستگی سے انسانی وجود قائم ہوا ہی اور جو تعلق الٰہی رموز میں داخل ہی یہہ بدن جسکو انجیلی تعلیم خدا کی ہیکل بتاتی ہی۔ جو روح کا مسکن ہی اور جس پر وہ حاوی ہو کر اختیار کُلّی رکھتی ہی اور اُس کے ہر ایک حس و حرکت سے واقف ہے اور جسپر وہ اپنے نقش و نگار کا پورا خاکہ کھینچتی ہی اسکو تناسخ کی تعلیم جیو کا بندھن بتاتی ہی جبکہ مصوّر ایک سادہ سے کاغذ پر اتنا اختیار رکھتا ہی کہ جوانی کی سی آتش خیز قوتِ متخیلہ کی بدولت اپنے خیال کو مسخر اور منقاد کر کے اُس پر ایسا خاکہ اُتار سکے کہ اُس کے ہنر و آفرینی کی طبیعت بیساختہ داد دے۔ اور جسکو زمانہ کی گرد صفحۂ تاریخ سے ہرگز مٹا نہ سکے۔ تو کتنا زیادہ اپنے بدن پر روح کا اختیار رہنا چاہئے۔ جس کی موجودگی سے بدن پرشان و تبسم۔ رخساروں پر ماہ تاباں سے جھلک الفت بھری نگاہیں اور چال میں رقص پیدا ہو جاتے ہیں۔ بدن کی بے حرمتی کرنا خدا کی صنعت پر دھبّہ لگاتا ہی۔ ہاں گناہ کی وجہ سے انسان اس بدن کی بے حرمتی کر رہا ہی اور اسکو حیوان سا بنا رکھا ہی بلکہ کل کائنات کی بے حرمتی کر رہا ہی

کیونکہ اُس میں ایسا محو ہو گیا ہی کہ دنیا ہی اُس کی معبود ہو چکی ہی لیکن جب خدا موجود ہی اور جو اُس نے بنایا اچھا بنایا تھا۔ اِس لئے وہ خود انسان کو محبت کی راہ سے گمراہی سے نکال کر راہ پر بطالت سے نکال کر حق پر۔ اور موت سے نکال کر زندگی میں لاتا ہی۔ مسیح نے کہا راہ حق اور زندگی میں ہوں۔ خداوند مسیح نے بدن کو حقیر نہیں سمجھا بلکہ اُس میں داخل ہو کر انسانیت کو اصلی منصب تک پہنچایا اور موت پر غالب ہو کر جلالی صورت میں بدن سمیت قبر میں سے نکل آیا اور اُن میں سے جو سو گئے ہیں پہلا پھل ہوا اور پولس رسول اس قیامت کے بدن کی یوں تشریح کرتا ہی۔ وہ فنا میں بویا جاتا ہی۔ بقا میں اُٹھتا ہی۔ بے حرمتی میں بویا جاتا اور جلال میں اُٹھتا ہی نفس والا جسم بویا جاتا ہی اور روحانی جسم اُٹھتا ہی جیسے ذی جان میں ایک ایسی جبلتی طاقت موجود ہوتی ہی جو اپنی ذاتی خصوصیت رکھتی ہی اور بیج میں سے نشو و نما کے لئے ضروری اشیائے اپنی خصوصیت قائم رکھنے کے لئے بہم پہنچاتی ہی اسی طرح سے روح میں اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا جوہر عنائت ہی۔ اس دنیا میں روح کا پہناوا جسمانی ہوتا ہی۔ جو خاک ہو جاتا ہی آئندہ دنیا میں اُس کا پیراہن لطیف جسم کا ہوگا۔ جو سورج کی طرح چمکیگا۔ بدن میں روح ہی جان ڈالتی ہی اور روح ہی کے طفیل ہم ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور آئندہ بھی اسی لئے پہچانینگے۔ وہاں لوگ فرشتہ سے ہونگے وہاں خون والا نفسانی جسم نہیں ہوگا اس لئے بھوک پیاس ہوا کو سانس میں لینے کی ضرورت نہ ہوگی ان اعضار کی بھی ضرورت نہ ہوگی جواب ہماری رفتار و گفتار میں سدِ راہ ہوتے ہیں۔ ہمارا بدن انسانی ہوگا لیکن روحانی جس میں ہمارا باطن صاف اور پاکیزہ طور پر ظاہر ہوگا۔ وہاں زوال نہ ہوگا۔ بلکہ ہمارا بدن غیر فانی ہوگا۔ جس میں جوانی بدستور قائم رہیگی۔ نور والا بدن ہوگا جس میں محسوسات فی الخارج کو ہم مصفّا اور پاکیزہ علم سے دیکھینگے اور ہماری رفتار بدنی۔ برقی رفتار ہو جاویگی ہماری اپنی آنکھوں کی نظر جواب دوربین

اور خُردبین کا آسرا لئے ہوئیں ہیں۔ آئندہ بہت تیز اور زور والی ہو جاویگی۔ کیونکہ کانوں نے نہیں سُنا نہ آنکھوں نے دیکھا نہ انسان کے دل میں داخل ہوا ان چیزوں کی نسبت جو خدا نے ہمارے لئے تیار کی ہیں۔ یہہ بے حرمتی کا بدن جواب بھدّا اور گھنَاؤنا سا نظر آتا ہی۔ خوبصورتی میں آفتاب کی طرح چمکیگا۔ پنڈت موصوف محض سُکھہ کا حاصل کرنا جیو کا دھرم بتاتے ہیں اور یہہ سُکھہ مکتی میں بہت بڑھہ جاتا ہی۔ اگر جیو کا یہی خاصہ ہی کہ بندھن میں آ کر سُکھہ دُکھہ کو بھوگے۔ اور چھٹکر بہت سُکھہ کو بھوگے۔ تو یہہ سُکھہ نہیں حاصل ہونا رہتا ہی اور دُکھہ کا ہونا بھی پاپ تصور نہ ہوگا بلکہ پاپ اور اُس کا نتیجہ دُکھہ۔ اس امر کا شاہد ہوگا کہ جیو میں مختلف مدارج گھٹاؤ بڑھاؤ کا بُرائی میں شمار نہیں کرنا چاہئے۔ جیسے جنگل میں درختوں کا بڑھاؤ یکساں نہیں ہوتا بعض تو اُن میں گھٹیا ہوتے ہیں۔ اور بعض بڑھیا۔ اسی طرح انسانوں میں بعض نیکی اور اخلاق کے انداز و پیمان میں اعلیٰ معیار تک پہنچے ہوئے ہیں۔ بعض کی ترقی کسی قدر ٹیڑھی واقع ہوئی ہی مگر یہہ مختلف حالتیں لاانتہا زندگی کا خاصہ ہے۔ بلکہ گُناہ بھی نیکی اور خوبی کی لازمی شرط قرار دیا جاویگا۔ جیسے لڑکا گر گر کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتا ہی اور بتدریج خود مختار بنتا ہی اسی طرح گُناہ کی موجودگی انسان کو اُس کے ساتھہ مقابلہ کرنے سے مضبوط بناتا ہی۔ اس لئے گناہ ناکمل انسان کے لئے ایک نیکی کا وسیلہ ہوگا۔ علاوہ دُکھہ سُکھہ کو پیدا کرتا ہی۔ ادنیٰ جیوں کو اگر اعلیٰ جیو نہ کھاویں تو اُن کی کثرت وبال جان ہو جائے۔ لہذا ادنیٰ جیوں کا اعلیٰ جیوں کا لقمۂ خوراک بننا بھلائی میں داخل ہی۔ ایک عضو کا کاٹا جانا گو ظاہرا بدی نظر آوے۔ لیکن اگر اُس کے کاٹنے سے انسان کی جان بچتی ہی تو اُس کا کاٹا جانا بُرائی نہ رہا۔ لڑائیں گو بُرائی شمار کی جائے لیکن اگر وہ ہمارے ملکی اور مذہبی حقوق قائم رکھنے کا باعث ہوں تو کون لڑائیوں کو بُرا گِنیگا؟ حقیقت میں تناسخ کے فلسفہ

نے اِنسان کو خود مختار کر کے شتر بے مُہار کی طرح چھوڑ دیا ہی اور اس امر سے انکار کیا ہی کہ اس دنیا کا کوئی اخلاقی حاکم ہی- بائبل کی تعلیم اس امر پر زور دیتی ہی- کہ دُنیا سے خدا نے اپنا تعلق منقطع نہیں کر دیا ہی- بلکہ وہ جو راست اور سچّا اور پاک اور برحق ہی اُس نے دنیا کی حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی ہوئی ہی- اس لئے راستی اور پاکیزگی کا تسلّط ہوگا- اور ناراستی نیست و نابود کیجاویگی- خدا کا جلال راستی اور سچّائی اور پاکیزگی کے ساتھ ظاہر کرنا- اِنسان کی زندگی کی علّت غائی ہی- اور اسی میں اُس کی خوشی منحصر ہی- لیکن پنڈت جی کو یہہ خدشہ ہی کہ جس قدر بوجھ کوئی اُٹھا سکتا ہی اسی قدر اُس پر رکھنا چاہئے- ذرا سے علم اور طاقت والے جیو پر لاانتہا سُکھ کا بوجھ رکھ دینا ٹھیک نہیں ہی- اس لئے یہی اچھا ہی کہ مکتی کے اندر پرمیشور میں ہو کر وہ بہت سُکھ بھوگ کر پھر بندھن میں آوے- لیجئے ہم پنڈت جی کا خدشہ مٹا دیتے ہیں جیو کو جیو مکت ہونے کی ضرورت ہی نہیں- وہ تناسخ کے چکّر میں مُکت جیو کے سُکھ کو نہیں بھوگتا ہی- رامچندر جی کو جنم لئے کئی صدئیں گذر چکی ہیں- فرض کرو بیسویں صدی میں انیک جنموں کے سنسکار کے بعد وہ دوبارا اُسی جنم میں آئے- جس میں تواریخ اُن کا ذکر کرتی ہی- ہوش سمبھالتے ہی آپ نے معلوم کیا- کہ پہلے جنم میں تو وہ رتھ پر سوار ہوا کرتے تھے خدمت گار پادر ہا اُن کے ہمرکاب ہوتے تھے اور جھاڑ اور فانوس مکان میں- ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لئے وقت کی ضرورت- سامان کی ضرورت- زادراہ کی ضرورت- ہر ایک چیز کی ضرورت سدِ راہ ہوتی تھی- ہندوستان کے ایک حصّہ سے دوسرے حصّہ میں جانے کے لئے انسانی عمر کا خاصہ حصّہ درکار ہوتا تھا- ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کی کانوں تک آواز نہیں پہنچتی تھی- غرضیکہ اُس وقت کی تہذیب اور بیسویں صدی کی تہذیب میں آپ نے آسمان و

زمین کا فرق پایا- ابتو وحشت اور رم کے آثار کوسوں دور بھاگتے ہیں- ابتو اپنے حواس وانستہ کرن میں لاانتہا بینائی محسوس کرتے ہیں- ابتو ارادہ کرنے کی دیری ہی ورنہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیڑی پار ہی- ابتو آنکھوں کی مدد ایسے آلات مہیّا ہیں جو ادنےٰ سے ادنےٰ اور لطیف سے لطیف تر اور دور سے دور تر چیزوں کو گھر بیٹھے دیکھتے ہیں- ابتو فاصلہ مفقود- زمان و مکان مفقود نظر آتا ہی- ایک ملک دوسرے سے یوں باتیں کرتا ہی- جیسے ایک ہی کمرہ میں دو اشخاص آپس میں مخاطب ہوں- انسان نے آگ پانی ہوا بلکہ ویدوں کے تمام نیچری دیوتے- اپنے قابو میں کر رکھے ہیں بلکہ نیچر کی باگ کو پکڑا ہوا اُس سے اپنی خدمت لیتا ہی اور روشنی کا وہ عالم- کہ خود برق اُن کے بزم اور شبستان میں رونق افروز ہی- اگر یہی رامچندر جی کچھ صدیوں کے بعد پھر دُنیا میں آئے- تو اُن کا سُکھ غیر معمولی سُکھ ہو جاویگا- کہاں پہلے رتھ پر سوار آئے دن نیچر پر سوار- اور آکاش کا سیر کرتے ہوئے پاوینگے- اور تمام دنیا کا گشت لگاتے پھرینگے- اور جو جو ارادہ میں آویگا- وہ وہ عجائبات اور وہ وہ خواہش حاصل ہونگی جو پہلے خواب و وہم میں بھی نہیں گذرتی تھیں- بلکہ صدیوں کی جہالت کے پردہ کے اُٹھ جانے سے وہ کائنات کو اپنی آنکھوں کے سامنے ایسا دیکھینگے- جیسا پہلے بن باس میں بیل بوٹوں کا ملاحظہ کیا کرتے تھے- ان کا چہرہ بھی ادباری زمانہ کی گرد جھاڑ کر آئے دن ایسا نُورانی نظر آنے لگیگا- کہ بندھن کا خیال تک بھی کافور ہو جائیگا- اور ادباری زمانہ کی سیتا اگر اُنکے سامنے کھڑی کر دی جائے- تو اُن کی مُکت والی حالت دیکھ کر بلاساختہ اپنی زبان حال سے کہہ اُٹھیگی- کہ مجھ بندھن والی عورت سے دور رہو- کیونکہ میں تیرے زمانہ حال کے نُورانی چہرے کی تاب نہیں لاسکتی- جس کے آگے میرے چہرے کی روشنی ماند پڑ جاتی ہی- اور تیرے روشن

انڈیا سے ہیری نظر میں جنکا چوندھ ہوئے جاتی ہی جسں شخص کتی کا بیان پنڈت موصوف کرتے ہیں وہ تو یہیں میتسر ہوتی جاتی ہی۔ اس سے تناسخ کی فلسفہ بالکل باطل ثابت ہوتی ہی کیونکہ ویدوں کے زمانے کے رشی جو بیویں صدی میں انسانی جنم لیتے ہونگے۔ وہ اُس صدی کے بندھن میں اپنے کرموں کے لئے وہی ثمرے نہیں بھوگتے ہیں۔ جو پہلے بھوگ چکے۔ بلکہ ایسے ثمرے جن کے لئے اُنہوں نے محنت نہیں کی۔ پس خدا کا کلام صادق ٹھیرا۔ جو کہتا ہی کہ جو باپ دادے بوتے ہیں اُن کا ثمرہ آنے والی نسلیں کاٹتی ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں ہر ابتدائے را انتہا مقرر است۔ و ہر آغاز را انجامے معین ہزارہا سوسائٹیں اس دنیا کی سٹیج پر آئیں۔ اور ہماری نظر سے ایسی غائب ہو گئی ہیں کہ ان کے نادرہ روزگار بھی نقش بر آب کی طرح چندے مہمان رہکر پردہ غائب میں داخل ہوئے ہیں۔ یونان و مصر اور روم اور ہندوستان اور اسلام کی قدیم اور زبردست حکومتیں۔ جن کو تجمل شاہانہ اور تہذیب اور علم اور مایہ سب کچھ نصیب ہوا لیکن بقول سعدی گر ہستند بروئے زمیں۔ یک نشاں نماند۔ زوال نے سب کو آ دبوچا اور دبوچتا ہی۔ لیکن یہہ کلام جو کہتا ہی کہ آسمان و زمین ٹل جائینگے پر میرا کلام ہرگز نہیں ٹلیگا۔ وہ تمام جماعتوں کو جو تھیں اور جو ہیں اور ہونگی۔ پھر فراہم کریگا۔ اور ان میں سے اپنے بندوں کی ایک ایسی جماعت بنادیگا جو علاوہ وارث ہونے ان تمام مخترعات ذہنی اور معلومات اور تہذیب و تمدّن کے جو لکھو کھا صدیوں کی نسلاً بعد نسلٍ انسانی کمائی ہوگی۔ وہ جماعت اُس آسمانی اور برتر اعلیٰ میراث کو پاویگی۔ جو بے زوال اور ناآلودہ اور غیر فانی ہی۔ اہنو موالید ثلاثہ میں ایک نسل کے بعد دوسری نسل اُس کی قائم مقامی کو موجود ہو جاتی ہی۔ ایک خاندان کے بعد دوسرا اُسی رتبہ کا وارث ہو جاتا ہی۔ قریب کے متوسلین کے بعد بعید کے سلسلۂ دنیا کے جاری رکھنے کے مالک ہو جاتے

ہیں لیکن اُس آئندہ جماعت میں قریب کے اور بعید کے سب فراہم ہو کر آپس میں بالمشافہ ہونگے۔ اور اُس عمارت میں داخل ہونگے۔ جس کے ردا پر ردا اُٹھانے میں ہر ایک بشر کا شروع سے تا آخر ہاتھہ لگا تھا۔

پھر تناسخ کا مسئلہ اس بات پر زور دیتا ہی کہ دُنیا میں جیوؤں کی حالتیں یکساں نظر نہیں آتیں۔ کوئی اندھا پیدا ہوتا ہی۔ کوئی سوجاکھا۔ کوئی امیر اور کوئی غریب ان حالتوں کو دیکھہ کر پچھلے کرموں کا قیاس ہوتا ہی۔ پنڈت لیکھرام یہہ اضافہ کرتے ہیں۔ کہ پیدائشی اور قدرتی بیماریاں سابقہ اعمال کا نتیجہ ہیں۔ ہر ایک علّت کے واسطے ایک معلول کی ضرورت ہی۔ مرض کا سبب اور علّت کا معلول دریافت کرنا حکما کا کام ہی۔ لہذا جنم کے اندھے۔ لولے۔ لنگڑے۔ بہرے وغیرہ کا سبب اُن کے سابقہ اعمال ہیں۔ اور پرنکش کے معنے بیان کرکے کہ جو حواسوں سے بغیر کسی طرح کے بھرم اور وہم اور خبط کے جو گیان حاصل ہوئے یہہ کہتے ہیں کہ آواگون کی دلیل پرنکش ثابت ہی۔ پنڈت لیکھرام جو پرنکش کے معنے قائم کرتے ہیں وہ بھی قیاس ہی اور بس۔ یہہ سچ ہی کہ دنیا میں خال خال بلکہ یوں کہنا صحیح ہی کہ کسی شہر کی آبادی میں ہزاروں میں ایک آدھ اندھے۔ لولے۔ لنگڑے وغیرہ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن بھرم اور وہم اور خبط سے بچنے کے لئے پہلے یہہ دریافت کرنا ضروری ہی کہ اندھے۔ لولے ہونے میں استثنائی قاعدہ کیوں نظر آتا ہی ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ غریبی میں ہزاروں مبتلا ہیں۔ بیماری سب کا یکساں حصّہ ہی۔ دُکھہ سے کوئی بھی مستثنےٰ نہیں۔ بقول آریہ لکھو کھا جیو حیوانوں کی جونوں میں بھوگ جونی کر رہے ہیں تو کیا وجہ ہی کہ اندھا اور لولا ہونا استثنائی صورت اختیار کرے ؟ یہہ دیکھہ کر فوراً یہہ قیاس ہوتا ہی۔ کہ یہہ استثنا جسمانی سبب رکھتا ہی نہ کہ اعمالی۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جنم کا اندھا بدستور آنکھہ تو

رکھتا ہی۔ اُس کا عضو تو قائم ہی۔ لیکن کسی نہ کسی وجہ سے اُس عضو کا تعلق روشنی کے ساتھ بند ہی۔ بعض ڈاکٹر بعض اندھوں کی آنکھوں کا روشنی کے ساتھ تعلق قائم کرنے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اور اسی طرح بہیروں کی نسبت بھی۔ اور لنگڑوں کے بارے میں تو ایسی ٹانگیں بہم پہنچائی گئی ہیں۔ کہ اُن کو فطرتی ٹانگوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی ہی تو اس صورت میں ہمارے قیاس کو اور بھی زیادہ تقویت ہو جاتی ہی۔ کہ اندھوں۔ لنگڑوں اور لولوں کا ایسا ہونا جسمانی سبب رکھتا ہی نہ کہ اعمالی۔ بفرض محال اندھا پیدا ہونا سابقہ اعمال کے سبب سے ہی۔ اور پرمیشر نے جیو کو قالب دیتے ہوئے اُس کو اندھا پیدا کیا ہی۔ تو پھر یہہ قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ اِس صورت میں جیو کو انسانی قالب دیتے ہوئے اندھے کو آنکھ کا عضو ہی نہ دیتا کیونکہ جب ہم دنیا میں ایسے انسانی جیو دیکھتے کہ جن میں بعض تو ایسے پیدا ہوئے ہیں۔ جو ہاتھ کا عضو نہیں رکھتے۔ اور کوئی پاؤں سے محروم ہیں۔ اور کوئی آنکھ سے یعنے اوروں میں تو وہ اعضا موجود ہیں اور ان میں معدوم اور استثنائی صورت بھی نہ ہوتی بلکہ عام قاعدہ ہوتا ہی تو شاید سابقہ اعمال کا مسئلہ قرین قیاس ہوتا لیکن ایسا تو کہیں نظر نہیں آتا۔ علاوہ جنم کا اندھا۔ لنگڑا یا لولا تو فقط ایک عضو سے محروم رکھا گیا ہی۔ تاکہ بقول آریہ وہ سابقہ اعمال کی سزا بھگتے لیکن بعض جیو تو تمام اعضا سے محروم رکھے جاکر پیدا ہوتے ہیں۔ جو ماں کے رحم ہی میں مر جاتے ہیں اور مرے ہوئے پیدا ہوتے ہیں تو ہم پوچھتے ہیں ایسوں نے اعمال سابقہ کا کیا ثمرہ بھوگا؟ اور جب پرندہ کی طرح پرواز کر کے کسی شاخ پر جا پہنچے تو وہاں پر سے کیا وہ مکت جیو ہو گئے یا کسی اور بندھن میں آئے؟ اور جو کچھہ ہوئے یا بنے وہ کس سابقہ اعمال کے بدلے؟ حقیقت یہہ ہی کہ یہہ دلیل بلا ثبوت وشہادت پیش کی جاتی ہی۔ پنڈت دیانند صاحب

انومان پرمان یعنے قیاس پر زور دیتے ہیں۔ جس طرح طب سے ناواقف بھی بخار وغیرہ ہونے سے اتنا جان سکتا ہی۔ کہ مجھہ سے کوئی بدپرہیزی ہو گئی ہی۔ اسی طرح دنیا میں گوناگوں سُکھہ دُکھہ کے گھٹاؤ بڑھاؤ کو دیکھہ کر پچھلے کرموں کا قیاس ہوتا ہی۔ بدپرہیزی کا دُکھہ جسم سے تعلق رکھتا ہی اُس کو محسوس کر کے بیشک بیمار قیاس کر سکتا ہی کہ اُس سے کچھہ بدپرہیزی ہوئی ہی۔ اور جب تک وہ نقص قائم ہی اُسکو چین وقرار نہیں ہو سکتا۔ وہ صحت یابی کی خاطر ہزارہا علاج معالجہ کراویگا اگر صحت حاصل ہوئی زہے قسمت ورنہ وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو جاویگا۔ دوسرے شائد یہہ بھی قیاس دوڑائینگے۔ کہ اُس کو جن یا ڈائن چمٹی ہوئی ہی۔ شاید سحر یا جادو کا اثر ہی۔ اور جھاڑ پھونک سے اُس کی جان کو اور بھی زیادہ وبال میں ڈال دیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جنم کا اندھا اپنی نابینائی کو دُکھہ تصوّر نہیں کرتا ہی۔ جس نے بینائی کی نعمت کے مزہ ہی کو نہ چکھّا ہو۔ وہ اُس کے نہ ہونے کا دُکھہ محسوس نہیں کر سکتا۔ ہاں وہ دوسروں کے سُنے سُنائے اُس کے حاصل کرنے کا خواہشمند ہو تو ہو۔ لیکن نہ حاصل ہونے سے وہ اپنی زندگی کو بیزار اور نکمّا نہیں سمجھیگا۔ جو کچھہ اُس کو حاصل ہی اُن کو عمل میں لاکر دوسروں کی طرح سُکھہ کے سامان مہیّا کریگا۔ اُس کی ایک عضو کی کمی کی تلافی دوسرے اعضا کے ترقی دینے پر ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہوتا رہتا ہی۔ اگر کوئی اندھا ترقی نہ کرے تو اس کی وہی وجہ ہوگی جو ہم کو سوجاکھوں کی جماعت میں نظر آتی ہی۔ یعنے کوئی تو اپنے استعداد کو کام میں لاکر سُکھہ کے سامان بڑھائیگا۔ اور کوئی نہ استعمال کر کے جو اُس کے پاس ہی وہ بھی گنوائیگا۔ فرض کرو دُنیا میں اندھے ہی اندھے پیدا ہوتے۔ تو کیا وہ اندھا ہونا اپنے سابقہ اعمال کا پھل سمجھتے؟ ہرگز نہیں وہ نہ بتا سکتے کہ رنگ یا روشنی کس جانور کا نام ہی لیکن جب

وہ اوزار دیکھنے کا اُن کو دیا ہی نہ گیا ہوتا تو اُس کا دُکھ کیسا؟ اگر سُن بھی لیتے کہ رنگ بھی ایک ایسی نعمت ہی جس سے خوشی پیدا ہوتی ہی۔ تو اُس کے دریافت کا ذریعہ وہی حواس ہو سکتے جو اُن کے پاس موجود ہیں۔ چنانچہ جب ایک جنم کے اندھے کو پوچھا گیا کہ گلاب کا رنگ کیسا ہوتا ہی۔ تو اُس نے جواب دیا کہ دور کے بادل کی گرج کی طرح۔ اس لئے یہ ثابت ہوا کہ جنم کا اندھا آنکھوں کا نہ ہونا دُکھ کے طور پر بھوگ نہیں رہا ہی۔ اور جب دُکھ نہیں تو یہہ قیاس بھی غلط ٹھہرا۔ کہ وہ سابقہ اعمال کا دُکھ بھوگ رہا ہی۔ باقی رہا پنڈت جی کا ایسا قیاس کرنا وہ تو ویسا ہی قیاس ہوا جیسا کوئی بیمار کو کہے کہ تیرا تو کوئی ڈائن کلیجہ کھا رہی ہی۔ علاوہ یہہ مسلمہ ہی کہ کسی شے کا کارن دریافت کرنے کے واسطے جب ہم کو کوئی وجہ نزدیک کی معلوم ہو جاوے کہ مناسب حال اور شافی جواب ہو۔ تو ہم دور کا قیاس ہرگز نہیں کرینگے۔ اگر پتھر کے گرنے سے ایک شیشہ ٹوٹ گیا ہو تو ہم کو ایک سلسلہ کارنوں یا اسباب کا نظر آویگا۔ کشش۔ پتھر کا سخت ہونا۔ شیشہ کا نرم ہونا وغیرہ۔ لیکن ان تمام وجوہ کو قطع نظر کر کے اگر سر دست یہہ قیاس کر بیٹھیں۔ کہ شیشہ کو قضا نے توڑا۔ تو یہہ جواب ایک مورکھ کو پھب جائے تو سہی۔ لیکن محقق کے لئے ہرگز یقین پیدا نہیں کریگا۔ حقیقت یہہ ہی کہ امر تنقیح جو زیر بحث ہی اُس کو آریہ لوگ فرض کر لیتے ہیں۔ جیو کے سابقہ اعمال کا قیاس اِس بنیاد پر کیا جاتا ہی کہ جیو ازلی ہی۔ لیکن جب جیو کا ازلی ہونا ہی ثابت نہیں ہی تو پھر سابقہ اعمال کا قیاس محض خبط ہی۔ آریوں کا عقیدہ دوسروں کے لئے حجت نہیں ہو سکتی۔ ہم کو جب موجودہ مختلف حالات کے موجودہ اسباب نظر آتے ہیں تو ہم پھر دُور کا قیاس کیوں کریں؟ کسی کا جنم کا اندھا پیدا ہونے میں نہ تو اُس میں خدا کی انصافی یا بے انصافی کا تعلق نظر آتا ہی۔ اور نہ اندھے کے کرم کا تعلق۔ بلکہ ما باپ

کے ساتھ اُس کا جسمانی تعلق ہونے کی وجہ سے یہہ نقص اُس کے حصہ میں کسی نہ کسی جسمانی وجہ سے واقع ہوا ہی۔ اِسی لئے خداوند مسیح نے کہا کہ نہ تو اندھے نے کوئی گُناہ کیا۔ اور نہ اُس کے ما باپ نے کہ وہ اندھا پیدا ہوا۔ بلکہ اس لئے کہ خدا کا جلال اُس میں ظاہر ہو۔ جیسا جسکو دیا گیا ہی اُس سے اُس کے مطابق مواخذہ کیا جاویگا۔ مانا کہ ایک پہلو سے اِنسانوں کی حالتیں اس دنیا میں برابر نہیں ہیں۔ لیکن دنیا ایک میدان رزم ہی کہ جس میں مستعد غالب ہوتے ہیں۔ اور ضعیف ہلاک۔ ذی اختیار اِنسان اس دنیا میں آتا ہی خارجی تعلقات جن سے وہ گھرا ہوا ہی اُن سے وابستہ ہو کر۔ یا تو اُن کا شکار رہتا ہی اور یا اُن پر حکمران ہوتا ہی۔ اس دُنیا میں خود حفاظت کے لئے وقت کے ہر لمحہ میں موت کے ساتھ مقابلہ رہتا ہی۔ جس میں ہزارہا حیوانات تو غائب نظر آتے ہیں۔ اور ہزارہا ہی مغلوب انسانی طبقہ میں سینکڑوں بمقابلہ دوسروں کے ذی اختیار بن گئے ہیں۔ اور سینکڑوں نے غلامی صورت اختیار کی ہوئی ہی۔ یہاں تو کرموں کی فلسفہ نظر آتی ہی یعنے یہہ کہ استعداد ودیعی کا واجب یا غیر واجب استعمال کرنا۔ اور اُس کے مطابق سُکھی یا دُکھی بننا۔ خواہ وہ اندھا ہو یا سوجاکھا۔ لیکن یوہیں کسی کو کرم کا پُتلا بنانا پیشتر کہ اُس نے اپنی استعداد کو واجب یا غیر واجب استعمال کیا ہو یا نہیں۔ محض قیاسی ڈھکوسلا ہی۔ اس کے علاوہ ہم صریحاً دیکھتے ہیں کہ باپ دادوں کے خصائص بد اور نیک ورثہ میں ہمارا حصہ ہوتے ہیں پس جب نزدیک کا سبب بمرتبہ بیّن ہی۔ تو اس صورت میں پچھلے کرموں کا قیاس کرنا حماقت ہی۔ علاوہ اس کے انسانی تجربہ اپنی کسی ماقبل ہستی کا شاہد نہیں ہی۔ اس لئے جیو ازلی نہیں ہی۔ وہ ازلی نہیں کیونکہ اُس کی اپنی شہادت اپنی نسبت یہی ہی کہ اُس کی ابتدا ہوئی۔ وہ محتاج بالغیر ہی۔ وہ از خود نہیں ہی۔ بلکہ وجود میں لایا گیا ہی۔ ہم سے پوچھا جاتا ہی

کہاں سے ؟ جواب واجب الوجود خدا سے۔ کس طرح۔ نیستی میں سے ؟ جواب نہیں۔ نیستی میں سے نہیں۔ کیونکہ نیستی کوئی چیز نہیں۔ نیستی وجود کی منفی ہے۔ پھر کہاں سے ؟ جواب خدا سے جو واجب الوجود و مستغنی الذات خدا ہے۔ کیا روح خدا کا کوئی ٹکڑا ہے۔ جواب نہیں۔ خدا کا ٹکڑا نہیں ہے۔ پھر کہاں سے۔ جواب خدا سے اُس کی ابتدا ہوئی۔ کیا ثبوت ؟ جواب سائنٹیفک روح اپنی نسبت شہادت کیا دیتی ہے ؟ جواب کہ وہ از خود نہیں بلکہ اُس کی ابتدا ہوئی۔ وہ محتاج بی الغیر ہے خدا اُسکا سہارا اور سبب ہے۔ ہم نہیں بتا سکتے کہ روح کس طرح پیدا ہوئی لیکن روح خود بتاتی ہے کہ خدا اُس کا سہارا اور سبب ہے اور کلام الٰہی اس امر کی تصدیق کرتا ہے۔ حیوانوں میں زندگی کا صدور ماکے رحم سے شروع ہوتا ہے۔ بطن ہی میں اُس کو شعور اور خواص مادری و پدری حاصل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نوعیت یا جنس میں ایک ترکیبی رشتہ پایا جاتا ہے۔ انسانی روح بھی بدن کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے۔ آدمی کی پیدائش حیوان میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ انسان ہی میں۔ یہی وجہ ہے کہ ماکے رحم میں بچہ کی حیثیت میں قوائے دماغی و روحانی و بدنی بتدریج ترقی کرتے ہیں۔ والدین کے خواص بچہ کے ورثہ میں آتے ہیں۔ جیسے نیچر کی طاقتیں لطیف ہونے کی وجہ سے اُن کے فعل کا ظہور مختلف کثیف چیزوں میں ہوتا ہے اسی طرح روح کی لطافت اس امر کی سدراہ نہیں ہوسکتی۔ کہ اُس کا ظہور ما باپ کی طرف سے نہ ہو۔ روح کی اصل پہلے ما باپ سے ہوئی۔ اور جس طرح خدا کا دخل نیچر کے اسباب ثانی میں بھی ہے۔ اسی طرح خدا کا دخل انسانی روح کے پیدا کرنے میں ہے۔ انسان کیا ہے۔ وہ ایک مجموعہ بدن اور روح کا ہے۔ مگر فعل مختار شخص ہے۔ اور وہ شخص ہی اپنے بدن اور روح کے اتحاد کا مرکز ہے۔ اس کے علاوہ وہ اخلاقی شخص ہے۔ وہ خود سے آگاہ ہے جس میں ۳ امور ہیں۔ خود اور

ناخود اور دونوں کا تعلق۔ ایک تو خودی کا علم ہے۔ اور ایک اس حقیقت کا جو وہ خود نہیں ہے انسان شخص ہے جو کہتا ہے میں۔ حیوان میں یہہ خودی نہیں ہے۔ وہ حرکت کرتے۔ کھاتے پیتے۔ اولاد پیدا کرتے۔ ان کی زندگی کا ایک انجام ہے۔ وہ اس میں حرکت کرتے ہیں۔ لیکن انسان فعل مختار اور خود مختار ہے۔ اور چونکہ کل مختار نہیں اور اپنے ہر ایک فعل میں ذمہ واری محسوس کرتا ہے اور دنیا سے سیری نہیں پاتا۔ اس لئے وہ خدا کا محتاج بھی ہے۔ وہ اُس کی قربت کا طالب ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے سوچ سمجھکر اور بحیثیت فعل مختار ہونے کے کرتا ہے۔ اُس کی خود علمی میں سہ امور ہیں۔ شخص۔ چیز۔ تعلق۔ ان حالتوں میں خود علمی عمل میں آتی ہے حیوان جانتا ہے لیکن یہہ نہیں کہ میں جانتا ہوں۔ اگر جانتا ہوتا تو وہیں کا نہیں ہرگز نہ رہتا بلکہ انسان کی طرح ترقی کرتا رہتا۔ انسانی بچہ بھی نہیں جانتا کہ میں جانتا ہوں کیونکہ اسکے خواص کی ترقی بتدریج ہوتی ہے ؛

لیکن علاوہ خود علمی کے ایک اور امر ہے۔ یعنے خود کا دو حالتوں میں وہی ہونا۔ اس میں دو حالتوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ میں ہوں۔ یہہ تو ایک علم اپنی نسبت ہوا۔ (۲) جو میں کل تھا وہی میں آج ہوں۔ اگر یہہ معدوم ہو تو انسان پاگل یا بیہوش گنا جاویگا وہی ہونا روح کا ہے نہ کہ بدن کے ٹکڑوں کا۔ آدمی پاگل بھی ہو جاوے لیکن اس کے وہی ہونا کا واقعہ بدل نہیں سکتا۔ تاہم خود علمی پر وہی ہونا منحصر ہے ؛

پھر یاد داشت ہے جس میں انسان مختلف حالتوں کو خود اپنی خود علمی سے پکڑے رہتا ہے۔ یہہ حالتیں زمانہ میں بدلتی رہتی ہیں۔ اور روح جو زمانہ کے بدل جانے میں بھی قائم رہتی ہے۔ انہیں حالتوں کے جاری رہنے پر منحصر ہے۔ اگر زمانہ کے دور میں وہی شخص موجود ہے۔ اور

وہی حالتیں بھی زمانہ کے دور میں قائم ہیں۔ تو یہی یادداشت ہی۔ یعنے اوّل حالتوں کا بدلنا حالتوں کا ایک دوسرے پر حصر۔ اور اُن کے گذر جانے پر بھی یاد رہنا۔ یاد میں آجانا یا یاد کر لینا۔ اِنسان اپنے تمام افعال میں بحیثیت فاعل ہوتا ہی۔ اس کے تمام افعال میں کوئی مقصد یا انجام ہوتا ہی +

یہہ تمام قوا جن کا ذکر ہوا یہہ اخلاقی جیو کی شرط ہی۔ آدمی جو کچھ کرتا ہی بحیثیت شخص ہونے کے کرتا ہی۔ وہ پتھر اُٹھاتا ہی۔ وہ پتھر کو دیکھتا ہی۔ سوچ و فکر کرتا ہی۔ اس میں اُس کے اُٹھانے کی اچھّا پیدا ہوتی ہی۔ باطن میں حرکت ہوتی ہی۔ وہ اُٹھانے لگتا ہی۔ لہذا انسانی روح میں دماغ و ذہن یا عقل ہی محسوس کرنا اور ارادہ ہی۔ یا یوں کہیں انسان میں عقل ہی۔ احساس باطنی ہیں۔ خواہشات ہیں۔ حرکات باطنی ہیں۔ اخلاقی احساس و جذبات ہیں۔ ارادہ ہی وغیرہ اُس کا تعلق نیچر سے ہی۔ ہمجنس سے ہی اور خدا سے ہی۔ جب ہم نے اوپر یہہ کہا تھا کہ انسانی تجربہ اپنی کسی ماقبل ہستی کا شاہد نہیں ہی۔ تو اس پر یہہ جواب دیا جاتا ہی۔ کہ ہم اپنے بچپن کی باتیں یاد نہیں کرتے۔ اور بہت سی باتیں ہم کو یاد نہیں رہتیں تو پچھلے جنم کی باتیں کیسے یاد رہیں۔ اور پنڈت لیکھرام اپنی کتاب ثبوت تناسخ میں کہتے ہیں یاد نہیں رہتا مرض نسیان کے باعث یاد نہیں رہتا دماغ کے پرمانو بدل جانے کے سبب اور جنم کے دوسرے جنم میں تبدل ہو جانے کی وجہ سے +

اوّل تو یہہ سوال کے جواب میں طرح دینا ہی۔ ثابت تو یہہ کرنا ہی کہ ہماری ماقبل ہستی ہی +
پنڈت دیانند نے جیو کے لنگ اچھا۔ دویش۔ پرتین سُکھ دُکھ گیان وغیرہ مانے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ روح تو ازلی ہی۔ تو ازل میں اُس کو کس کی اچھا تھی؟ کس کا سُکھ اور کس کا

دُکھ؟ اُس وقت تو یہہ سرشٹی بھی نہ تھی۔ تو یہہ جیو لنگ کہاں سے آ موجود ہوئے۔ بائبل کی تعلیم کے مطابق اِنسان کا تعلق نیچر۔ اِنسان اور خُدا سے ہی۔ ان تعلق میں اُس کے استعداد عمل میں آتی ہیں۔ لیکن جب دنیا ہی نہ تھی۔ تب تعلق بھی نہ تھا۔ اور جب تعلق نہ ہوا تو وہ لنگ کس مطلب کے اور کس برگ بوٹے کے نام تھے۔ لیکن بتایا جاتا ہی کہ وہ پرمیشر کی ازلی رعیّت ہی۔ کیا خوب ایسی رعیّت جو بحیثیت آقا و غلام کے ہوں۔ مگر جو نہ اُس کی خدمت کرتے اور نہ آقا اُن سے خدمت کراتا تاہم وہ معاوضہ کرتے اور یہہ مواخذہ کرتا وہ بیٹے جاتے۔ ہوش میں لائے جاتے۔ پھر پیٹے جاتے۔ سدھارے جاتے۔ اور پیٹے جاتے۔ بائبل کی تعلیم کے مطابق خدا کی رضاجوئی اور اُس کے وصل میں ہم کو چین اور سُکھ حاصل ہوتا ہی۔ باقی رہا یاد کے متعلق۔ سو بچہ نے ابھی تک ہوش نہیں سمبھالا ہی۔ وہ تا حال اپنی خودی کا مختار نہیں ہوا ہی۔ اور جس حال کہ خود مختاری معدوم ہی تو اُس سے کرم کا سلسلہ بھی جاری نہیں ہوا ہی۔ اور نہ یاد جو ایک خاص جوہر انسانی ہی عمل میں آیا ہی۔ لیکن جب وہ نوزائیدہ بچّہ کرم کرنے لگتا ہی تو وہ بہت کچھ یاد رکھتا اور یاد میں لاتا اور یاد کر لیتا ہی۔ اور بفرض محال بہت سے اپنی زندگی کے واقعات بھول بھی جائے۔ مگر ہر حالت اور موقعے میں اپنی خودی کو موجود پاتا ہی۔ لیکن ہم سے کہا جاتا ہی کہ یاد نہیں رہتا دماغ کے پرمانو بدل جانے کے سبب سے۔ اور کل جسم کے دوسرے جنم میں تبدل ہو جانے سے۔ مگر جب سائنس کے علما یہہ کہتے ہیں کہ ہمارا جسم تبدیل ہو رہا ہی۔ حتیٰ کہ سات سال کے بعد کوئی بھی ذرے جو پہلے موجود تھے باقی نہیں رہتے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اُس صورت میں بھی ہماری خودی اور خود علمی بدستور قائم رہتی ہی۔ تو اس شہادت سے یاد نہ رہنے کی دلیل کمزور ثابت ہوئی بلکہ ہماری دلیل کو زیادہ تقویت ہو جاتی ہی کہ انسان

کی روح ازلی نہیں ہی۔ بلکہ اُس کا ابتدا ہوا ہی۔ باقی رہا مرض نسیان کے سبب۔ اگر اس بنیاد پر پچھلے جنم کا قیاس صحیح ہی۔ تو انسانی طبقہ میں عجیب دماغی فتور واقع ہوا ہوگا۔ کہ بحیثیت خودمختار ہونے اور کرم کر کے انسان ایک جنم کے سنسکار سے دوسرے میں آیا۔ اور اپنی خودی کو خیرباد کہکے۔ کنجی اور قفل کے اندر پیچھے چھوڑ آیا۔ اس صورت میں تو وہ مخبوط الحواس ہوا۔ یا ایک شاہدولے کے چوہے کا چولا لیکر دنیا میں نمودار ہوا۔ وہ نہ صرف بدھو ہوکر آیا بلکہ زاہد وا اور بدھو ہوکر۔ لہذا اُس کی جونی کرم جونی نہ رہی۔ بلکہ ادنیٰ حیوان کی طرح بھوگ جونی ہوئی اِس کے علاوہ پھل بھوگنا بھی تو پچھلے کرموں کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ پھل بھوگنا اسپر منحصر نہیں ہی کہ ہمارے پاس کیا موجود ہی۔ بلکہ اسپر کہ ہم ہیں کیا۔ بنینگے کیا۔ پھل بھوگنا یہہ بھی نہیں ہی کہ ہم کو کیا کچھ میراث کے طور پر حاصل ہوا۔ بلکہ اس پر کہ ہم کماوینگے کیا۔ اگر مفلسی ہمارا حصہ اور بخرہ ہی تو کچھ مضائقہ نہیں جب غریبی میں بھی انمول دولت کمانیکی گنجائش ہی۔

کاٹ لینا ہر کٹھن منزل کا کچھ مشکل نہیں
ایک ذرا انسان میں چلنے کی ہمت چاہئے

اگر امیر اپنی دولت کے گھمنڈ میں خودغرضی اور خودنفسی اور ظالم اور محض سونے کا چٹم کرنے والا ہی۔ تو وہ واقعی اپنے لئے مفلسی کما رہا ہی۔ کیونکہ مسیح کے قول کے مطابق آدمی کو کیا فائدہ ہوا۔ کہ اُس نے تمام دُنیا کو تو کما لیا پر اپنے اصلی جوہر انسانی روح کو گنوا ڈالا۔ وہ اپنی روح کے بدلے کیا دے سکتا ہی؟

پھر ہم یہہ بھی دیکھتے ہیں کہ انسان کے بد یا نیک عمل کا اثر اُس کی اولاد پر پڑتا ہی۔ اگر کوئی امیری سے نادار ہوتا ہی۔ یا مرد ممتاز ہوکر بدنام ہوتا ہی۔ تو اُس کا داغ خاندان پر پڑتا ہی

اور اگر باپ یا ماں کسی عضو میں قاصر ہیں تو گاہے گاہے بچہ بھی اسی دہانچ میں پڑکر پیدا ہوا ہی۔ یہہ ایک ایسا معمّا ہی جسکو تناسخ کی فلسفہ نے حل نہیں کیا ہی۔ پھر جائے غور ہی کہ اس دنیا میں گو مختلف حالتیں نظر آتی ہیں تاہم ایک طرف تو موت بیماری مفارقت کا قلق ہونا یہہ سب کا برابر برابر حصّہ ہی۔ دوسری طرف ان ظاہری مختلفہ حالتوں کی وجہ نظر آتی ہی۔ بعض تو اچھی صحبت میں پڑکر اور اچھی تعلیم سے فیضیاب ہوکر۔ اچھے منصب کو پہنچتے ہیں۔ اور بعض بُری صحبت میں پڑکر بدنصیبی کے شکار بنتے ہیں۔ تاہم کوئی بھی ایسا نہیں ہی جو اپنے امکان کی رسائی تک کمال کو پہنچتا ہی۔ کوئی دولت میں پیدا ہوتا۔ کوئی دولت کماتا ہی۔ کوئی دولت بدچلنی سے ضائع کرتا ہی۔ کوئی حلال صورت سے اور کوئی حرام صورت سے دولت کماتا ہوا نظر آتا ہی اور گو دولتمند کو جسمانی لحاظ سے کسی چیز کی کمی نظر نہیں آتی۔ لیکن دماغی یا اخلاقی لحاظ سے اس میں کمی پائی جاتی ہی۔ اگر کوئی ذہن رسا ہی تو اُس میں دولت کی کمی پائی جاتی ہی اگر کوئی تمدن و اخلاق میں مرد ممتاز گردانا جاتا ہی۔ تو اُس میں بدنی کمزوری نظر آتی ہی۔ جب انسان میں بدن اور ذہن اور روح تین جوہر موجود ہیں۔ اور وہ صرف بدن کی احتیاج کی طرف سے غافل ہی۔ تو اُس کو حیوان سے تعبیر کیا جاویگا۔ کوئی اُس کو انسان نہیں کہیگا۔ اگر کسی کا دماغ ہی دماغ ہی لیکن وہ روح کی ضرورتوں سے بے بہرہ ہی۔ تو وہ خواہ کتنا ہی گیانی اور ودیارتھی گنا جاوے۔ لیکن وہ شخص اپنی ذات سے ناآشنا ہی۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ خدا اور شریعت کے ساتھ اُس کا کس قسم کا علاقہ ہی۔ غرضیکہ دنیا میں ایک طرح سے تو یکساں حالتیں نظر نہیں آتیں۔ کوئی امیر ہی تو کوئی غریب۔ کوئی عالم تو کوئی جاہل۔ کسی میں دماغی کمی ہی کسی میں بدنی۔ لیکن جب غور اور نظر نقاد سے دیکھا تو محتاج سب

کے سب ہیں۔ سیری کوئی بھی نہیں ہے۔ ایک میں اگر ایک چیز کی زیادتی ہے۔ تو دوسری میں
اُس کی کمی ہے۔ اور جس چیز کی پہلے میں کمی ہے وہ دوسری میں زیادہ ہے۔ ترازو کا پلڑا انسانی
حالتوں کے وزن کرنے میں کسی کا کسی خوبی کے کمی ہونے کی وجہ سے اوپر کو جاتا ہے۔ تو دوسرے
کا اُس خوبی کی زیادتی سے نیچے کو جھکتا نظر آتا ہے۔ اور یوں دُنیا کی حالتوں کا میزان کرتے
ہوئے ترازو کا پلڑا پورا اُترتا نظر نہیں آتا۔ غرضیکہ اربعہ متناسبہ لگانے سے معلوم ہوا کہ
سب کی حالتیں دنیا میں برابر ہیں۔ کم وبیش نہیں ہیں۔ دنیا کے منظر پر کوئی اپنی کمی ہیں
دوسرے کی زیادتی سے لیتا ہے۔ اور دوسرے کی زیادتی پہلے کی کمی کو سیر کرتی ہے۔ مختلف
حالتیں عارضاً مختلف ہیں لیکن حقیقت میں سب کی حالتیں فرداً فرداً مساوی ہیں۔ ایک
کی زندگی کا انحصار دوسرے پر ہے۔ ایک جماعت کا دوسری پر۔ قوم کا قوم پر اور ملک کا ملک
پر۔ ہمارا شخصی زندگی پر گذارہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اخلاقاً اور فرضاً ایک دوسرے کا ذمہ وار
بلکہ مقروض و دیندار ہے۔ اور جس قدر کسی ملک کے لوگ ایک دوسرے کے کفیل وضامن
ہوتے ہیں۔ وہ اسی قدر قومیت میں شرف حاصل کرتے ہیں اور اگر کسی ملک کے لوگ آپس
میں ایک دوسرے کو پھاڑتے ہیں۔ اور ظلم اور تشدّد برپا رکھتے ہیں۔ تو وہ قومیّت کے زینہ
سے گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ تناسخ کے مسئلہ کے مطابق ہر ایک فرداً فرداً اپنے کرموں
کا پھل بھوگ رہا ہے۔ میرا قالب میرے اپنے کرموں کا پھل ہے۔ اور تیرا قالب تیرے اپنے
کرموں کا کمایا ہوا ہے۔ اس تعلیم کے زیر اثر ہمارا آپس میں کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟ نہ ہم کسی کا
بھروسہ کریں اور نہ خود ہم اہل بھروسہ ثابت ہو سکتے ہیں نہ کوئی ہمارا محرم اور نہ ہم کسی کے
محرم راز ہو سکتے ہیں۔ ہم نہ ایک دوسرے کے ذمہ وار ہو سکتے ہیں۔ اور نہ کسی پر ہماری زندگی

کا انحصار ہو سکتا ہے۔ یہہ تعلیم سُکھ پیدا کرنے کے بجائے دُکھ پھیلاتی ہے۔ انسان کو انسان
سے جُدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس مسیحیت ہم کو یہہ سکھاتی ہے کہ ہر ایک دوسرے کے عضو ہیں۔
جس طرح ہاتھ نہیں کہسکتا آنکھ کو کہ مجھ کو تیری ضرورت نہیں۔ اسی طرح نہ ہم ایک دوسرے
کی نسبت یہہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎ ہم کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو ؛ ہم ایک دوسرے کے
ذمہ وار ہیں۔ امیر کی دولت ایک ضمانت ہے۔ بلکہ صورتِ تبادلہ رکھتی ہے۔ وہ اُن کمیوں کو پورا
کرتی ہے جن کا امیر محتاج ہے۔ اور جو دوسروں کی زیادتی سے میسّر ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک
ذہن رسا شخص اپنی عقلی معلومات کے بدلہ دولت کماتا ہے۔ اگر امیر محو دولت ہو کر غریب کو یاد
نہیں کرتا۔ بلکہ اپنی کوتاہیوں کی پورتی دوسروں سے زور کے غلبہ اور بلا ادائے اجرت حاصل
کرتا ہے۔ تو وہ جواب دہ ہے۔ نہ یہہ کہ وہ اپنے پچھلے کرموں کا پھل بھوگ رہا ہے۔ اور اگر بقول
پنڈت لیکھرام کرموں کا پھل یہاں بھی ملا کرتے ہیں۔ تو ایسے خود غرض کو امیر نہیں ہونا چاہیئے
بلکہ اُس کے بد افعال کا نتیجہ عین اُس کے حسب منشا نہیں ہونا چاہیئے۔ تناسخ کے مسئلہ کے مطابق
پھل بھوگنا کرم انوسار ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بُرے لوگ عموماً اپنا مطلب حاصل
کرتے ہیں اور سزا سے بچے رہتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس دنیا میں بغیر کرم کئے بھی
اِنسان دکھوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اچانک چھت گرنے سے ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی
ہیں۔ اچانک گولی لگنے سے ایک بے گناہ مارا جاتا ہے۔ علاوہ خوشنما چیزیں دیکھ کر خواہ
مخواہ انسان محظوظ ہوتا ہے۔ اور بدنما چیزیں دیکھکر انسان متنفر ہوتا ہے۔ وہاں کرموں کا کیا
تعلق ہے غرضیکہ ہمارا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نزدیکی بلکہ لازمی تعلق ہے۔ ہمارا باہمی
ایسا تعلق قائم ہے کہ ہم ایک دوسرے کی نسبت جواب دہ ہیں۔ یوروپ میں جو فساد یا بین بڑے

بڑے مالداروں اور مزدوری پیشہ لوگوں میں کبھی کبھی برپا ہوتا ہے۔ وہ اس اصول پر مبنی ہے کہ
دونوں آقا اور غلام کا کمائی کے متعلق ایک دوسرے پر حق ہے اگر آقا خود نفسی سے محض اپنی
شکم پُری اور تن پروری اور ملازمین کی حق تلفی کرتا ہے۔ تو یہہ زور اور غلبہ تب ہی تک جاری
رہتا ہے۔ جب تک ملازمین نے اپنے حقوق کو سمجھا نہیں ہے۔ اور آپس میں کلیہ اتفاق قائم
نہیں کیا ہے۔ لیکن جب معاملہ دیگرگوں ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے حقوق کو طلب کرنے پر آمادہ ہو جاتے
ہیں۔ اور مہذب قوموں میں نتیجہ یہہ ہوا اور ہوتا رہتا ہے۔ کہ غربا کی تہذیبی اور تمدنی اور جسمانی
آرام و آسائش کے سامان بڑھتے رہتے ہیں۔ اُن کی بہبودی اور رضاجوئی کے لئے اخباری
کلب وغیرہ جاری کئے جاتے ہیں۔ اُن کی اولاد کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست ہوتا رہتا ہے۔
اور ملک میں دولت کی افزائش اور تہذیب اور شائستگی نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن تناسخ کی تعلیم
کا نتیجہ فیٹلزم ہے۔ یعنے انسان کی ہمت کیا کرے جب قسمت وفا نہیں کرتی۔ اُس کے مطابق
ہر ایک جیو اپنے گذشتہ کرموں کے سبب جونی بھرمن کر رہے ہیں کیا یہی وجہ نہیں کہ اس
تعلیم کے زہریلے اثر نے ہند کے لوگوں کو ذاتوں میں۔ اور کام کے لحاظ سے پیشوں میں
بانٹ ڈالا ہے؟ یہاں نہ صرف غیر ملکی ملیچھ قرار دیا جاتا ہے بلکہ اپنے ایک دوسرے سے ایسے
جدا کئے گئے ہیں۔ گویا کہ ہمجنس ہی نہیں ہیں۔ نہ صرف چھوت چھات ہی پر زور بلکہ اکل و
شرب آپس میں بند ہے۔ اور خون و پوستین کی حفاظت میں ہندو۔ ہندو سے جدا ہے۔
اگر آج لوگ قوم قوم پکارنے لگے ہیں۔ اور ذات بندی کے توڑنے پر ساعی ہیں۔ اگر آج
سودیشی کی صدا کانوں میں گونجنے لگی ہے۔ اور ہر ایک رتبہ اور پیشہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا
جانے لگا ہے۔ بلکہ کسب کمال کے دور دوران میں مثلث صورت کے آدمی مربع شکل میں

دہنسنے لگے ہیں ....

اور تعلیم نسواں اور تعلیم عام پر اور نیچ ذات کے لوگوں کے اُٹھانے پر زور دیا جانے
لگا ہے۔ تو یہہ تناسخ کی تعلیم کا اثر نہیں ہے۔ جو کرموں کے لحاظ سے مرد کو عورت اور عورت کو
مرد اور ہر دو کو حیوانِ مطلق اور شامتِ اعمال کا تقدیری پُتلا بناتی ہے۔ بلکہ یہہ بائبل کی
پاکیزہ تعلیم کا اثر ہے۔ کیونکہ وہ تعلیم انسان کو جملہ تباہی اور بربادی کے رسوم و عادات۔ اور
غلامی کی قیود سے چھڑا کر اُسکو روحانی اور سربلندی کا اہل بناتی ہے۔ اور عبدیت کے
جوئے سے نکالکر۔ فرزندی کا رتبہ بخشتی ہے۔ وہ ادنی محنتوں کو عزت کا رتبہ دیتی ہے۔ وہ
انسان کو اعضائے یک دیگرند کے اصول پر کاربند کرتی ہے۔ وہ انسان کو خود اپنے سے
آشنائی اور خدا سے میل کراتی ہے۔ وہ صلح اور سلامتی کا پیغام دیتی۔ اور انسان کو انسان
سے بغل گیر کراتی ہے۔ دوسرے کے درد کو محسوس کرنا اور اُس کو اپنا سمجھنا۔ دوسروں کا خادم
بننا۔ نیچوں میں نیچا بنکر اور اُن کے احتیاج میں شریک ہو کر اُن کو اُٹھانا۔ یہہ مسیحی تعلیم کا خاصہ ہے۔
مسیحیت ایثار کی روح پیدا کرتی ہے۔ اور گھمنڈ اور تکبر کی روح کو توڑتی ہے۔ وہ خود غرضی اور
خود نفسی کی دشمن ہے۔ گھمنڈی کا سر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ غرور اور تکبر میں محو ہو کر انسان نہ خود
اپنے سے آشنا ہو سکتا ہے۔ اور نہ دوسروں کا درد پہچان اور نہ اُن کی قدر کر سکتا ہے۔ دوسروں
کی پہچان اور قدر کرنے کے لئے۔ انسان جب تک اُن کے درد میں شریک نہ ہو۔ وہ ہرگز
اُن کا پیشوا نہیں بن سکتا۔ اور اپنی قدر و منزلت کو تب ہی جانیگا جب اپنی خستگی اور تباہ
حالت سے آگاہی ہو جاوے۔ مسیح کی تمام زندگی بدلہ کی زندگی تھی۔ اُس نے دوسروں کی
خدمت کی۔ دوسروں کے درد میں شریک ہوا۔ دوسروں کی قدر کی۔ دوسروں کو اُٹھایا

دوسروں کے بدلے اپنی جان دی پیشتر کہ انسان اپنی امکانی منصبی حالت کو جانے یہہ
ضروری ہی کہ وہ اپنے دل سے پالتو بتوں کو نکال پھینکے - اور اپنے آپ کو شتہ کرے - تاکہ فروتنی
اور رحم اور پاکیزگی اور صلح والی طبیعت روح کے زیور ہو جاویں - الحاصل زندگی کی ظاہری
صورتوں میں یہہ قیاس کرنا کہ یہہ پچھلے کرموں کا پھل ہی صحیح نہیں ہی - بلکہ یہہ - کہ ہم خود کیسے
اور کیا ہیں - تب اُس سنہری اصول کو - کہ اگر زمانہ بتو نسازد - تو بزمانہ بساز - ہم حوصلہ سے
لپٹینگے - مگر پنڈت جی فرماتے ہیں کہ گھسیارے کی یہی خواہش ہوتی ہو کہ وہ لالہ جی بن جاوے
ایسی حسد والی خواہش سے اول انسان اپنی قدر کرنا چھوڑ دیتا ہی - اور اپنے کام کو حقارت کی نظر
سے دیکھنے لگ جاتا ہی - لیکن خداوند مسیح نے محنت اور جفاکشی کی قدر کی ہو اور ان کو معزز
بنایا ہی - اور خود غریب کے گھر میں پیدا ہو کر متواتر تیس برس تک محنت کرتا رہا - مفلسی ایسی
بے بہا دولت کما سکتی ہی جو کبھی امیر کو میسر نہ ہو - اس کے برعکس دولت انسان کو ایسی نکبت
اور ضلالت کے گڑھے میں گرا سکتی ہو کہ وہ سُکھ کا مطلق محتاج ہو جاوے - کیا سونا چاٹ کر انسان
سکھی ہو سکتا ہی ؟ ہرگز نہیں - بلکہ غریب اپنی کمائی کی دُکھی سُکھی چھوڑ کر اگر سونے کی طمع
کر بیٹھے تو اُس کی وہی دشہ ہو گی جو واقعی ایک غریب کے ساتھ گذری - چنانچہ وہ اپنی کمائی کا
ٹکڑا کما کر نہایت ہی بےچنت اور آزاد منش تھا مگر جس دن سے ایک امیر نے اسکی ظاہری حالت زار
پر ترس کھا کر اُسکو مال کی پونجی عطا کی اُس روز سے اُس کے دل میں سے چین اور اطمینان کا فوت
ہوا - اور اُس کے بجائے اضطرابی اور فکر دامنگیر ہوا - نہ رات کو آرام نہ دن کو - آخر چار ناچار
دولت امیر کی - یہہ کہکر اُس کو واپس کی - کہ اس نابکار دولت نے اُس کی نایاب موتی یعنے چین
ہی کو مٹا ڈالا تھا - اِس لئے مجھے چین کی روٹی اُس مال سے جو بے چینی کا طوفان برپا کرے -

بدرجہا پسند ہی - ہماری زندگی کا صحیح اندازہ ہماری بیرونی حالت پر منحصر نہیں ہی - ضرورت ایجاد
کی ماں ہی - بسا اوقات موجودہ مصائب اور تکالیف سُکھ کا باعث ہوئی ہیں - سُکھ دولت اور علم
کی تحصیل ہی سے پیدا نہیں ہوتا - بسمارک جو ملک جرمنی کا بڑا مدبر اور متمول اور مرد ممتاز ہو گذرا
ہی - اُس نے اپنی تمام زندگی کا تجربہ چند الفاظ میں یوں بیان کیا ہی - کہ میںنے اپنی تمام زندگی
میں ۲۴ گھنٹے سُکھ کے نہیں دیکھے - وہ تو علامۂ دہر تھا - دولت اور لیاقت میں یکتا تھا -
لیکن حقیقی سُکھ اِن خارجی اسباب پر منحصر نہیں تھا - جو اُسکے پاس موجود تھے - بلکہ اس پر کہ
اُس کی باطنی زندگی نے کس طرح ان کو استعمال کیا - سلیمان نے بھی کلامِ آلٰہی میں دُنیوی
تجربہ کا یہہ نتیجہ نکالا ہی - کہ سورج کے اندر سب کچھ باطل ہی - خدا کا خوف دانائی کا شروع ہی
ایوب کی زندگی سے ظاہر ہی کہ خدا نے سامان سے اُسکو بے سروسامان اور اولاد سے بے اولاد
کیا - جسمانی دکھوں سے اُس کو گھیر لیا لیکن وہ بندہ بتوکل خدا ہو کر اپنے دکھوں میں سُکھی بنا رہا
اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر دُکھ - سُکھ کو پیدا کرتا ہی - حاجت ہی شیر کو قوی ہیکل اور جسیم
اور تنا ور بناتا ہی - گیہوں کا دانہ زمین میں مر کر از سر نو بحال ہوتا ہی - محنت انسان کو جفاکش بناتی
ہی - سیرت و خصلت مقابلہ سے بنتا ہی - اسی طرح موجودہ زندگی کے مصائب عموماً کامیابی کے
زینے ہیں +

تناسخ کی تعلیم سُکھ دُکھ بھوگنے پر زور دیتی ہی - لیکن اس معمّا کا جواب نہیں دیتی کہ دنیا میں
دُکھ سُکھ کا حصّہ یکساں کیوں ہی - مسیحی تعلیم جتاتی ہو کہ گناہ کی مزدوری موت ہی - خدا سے جدائی
ہونے کی وجہ سے اِنسان میں موت وارد ہوئی ہی - اور موت کا ہمرکاب دُکھ ہی - اور روحانی
موت کے ساتھ جسمانی موت بھی سب کا حصہ ہوئی ہی - جو انگشت شہادت کی طرح آنے والی

غیر متناہی موت کو دکھاتی ہی۔ جسپر رحمت کا دروازہ بند ہی۔ یہی وجہ ہی کہ دنیا میں انسان کی حالت آزمائشی ہی۔ ناداری انسان کو بسا اوقات ظاہری ٹیپ ٹاپ۔ اور ان اسباب سے جن میں خوشی چندروزہ ہی ہٹاکر۔ ان اسباب پر دل کو لگاتی ہی۔ جو انجیلی اصطلاح میں آسمانی خزانہ کہلاتا ہی۔ جس کو زنگ نہیں لگتا۔ جسپر چور کا کھٹکا نہیں جو انسان کا باطنی جوہر بنکر اس میں راسخ اور مستحکم ثابت ہو جاتا ہی۔ ایسا کہ وہ اُس سے کوئی چھین نہیں سکتا اور جو اُس کے چہرہ پر بشاشت اور چین پیدا کرتا ہی۔ جن خوشیوں کی ظاہری اسباب پر تناسخ کی تعلیم نازاں ہی۔ ان سے سیری ہرگز نہیں ہو سکتی۔ وہ اسباب ہم سے جاتے رہتے ہیں ان پر حسد حملہ کرتا ہی۔ اُن کے سبب جنگ و جدل ہوتا۔ نفاق پیدا اور خُون ہوتا ہی۔ اُن سے۔ ایک خواہش کی سیری سے دوسری خواہش پیدا ہوتی ہی اور دوسری سے تیسری۔ کیا سچ کہا ہی خداوند مسیح نے کہ مال اپنے واسطے زمین پر جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور مورچا خراب کرتے ہیں۔ اور جہاں چور سیندھ مارتے اور چراتے ہیں۔ بلکہ مال اپنے لیئے آسمان پر جمع کرو *

اگر خدا ہماری زندگی میں مقدم ہی تب سب کچھ ہمارے لیئے حلال ہی لیکن خدا سے جُدا سب کچھ ہمارے اوپر حرام ہی۔ اسی واسطے خداوند مسیح نے یہہ بھی کہا کہ پہلے خدا کی راستبازی خدا کے جلال کو ڈھونڈو تو تمام چیزیں تم کو دی جاوینگی *